زخم

قیمت فی کاپی ۸ر

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

تصانیف نیاز فتحپوری

"نگار"
بک ایجنسی
لکھنؤ

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے وادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالا اپنی جگہ مجموعہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز حصۂ اول

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فنِ انشاء پر بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

مکتوبات نیاز (حصۂ دوم)

یہ حصہ پہلے حصہ سے زیادہ ضخیم ہے اور اس میں اکثر مکاتیب نقادی حیثیت رکھتے ہیں وہ حضرات جنھیں شعر و شاعری سے دلچسپی ہو انھیں ان مکاتیب میں بہت سے عجیب و غریب نکات شعری نظر آئیں گے رنگین تحریر اور اسلوب ادا کی دلکشی کا ذکر فضول ہے کیونکہ حضرت نیاز کی اس خصوصیت سے ہر شخص آگاہ ہے۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اُصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخئیل اسکی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی (۱)

شہوانیات مخلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے

نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب

ان تینوں جلدوں میں [illegible] سے لیکر [illegible] تک کے استفسار و جواب شایع کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ان تینوں جلدوں میں [illegible] تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اسکی حیثیت ایک [illegible]

قیمت فی جلد تین روپیہ علاوہ محصول

معجون شباب آور

اعصاب کو بے انتہا قوت دیتی ہے۔ دماغ اور دل پر خاص اثر ڈالتی ہے۔ اعتدال سے ہٹ جانے اور فطرت کے قوانین کی پابندی نہ کرنے سے جب قوت باہ میں کمزوری آجاتی ہے تو اسے "معجون شباب آور" ہی دور کر سکتی ہے۔ کیونکہ اسے اسی مقصد کے لئے خاص طور پر جدید تحقیقات کی روشنی میں طیار کیا گیا ہی

"معجون شباب آور" ہمدرد کی خاص ایجاد

قیمت فی شیشی (۲۰ دن کا پورا کورس) پانچ روپئے (صہ)

ہمدرد دواخانہ لیبوٹریز دہلی

دارالاشاعت نگار

یہ امر تقریباً طے پا چکا ہے کہ نگار اور دارالاشاعت نگار کو کسی جماعت کے سپرد کر کے انفرادی ملکیت کو ختم کر دیا جائے اور بڑا سرمایہ لگا کر دارالاشاعت کے کاروبار کو بہت وسعت دیدی جائے۔

اس لئے جو مصنفین اپنی کتابوں کے حقوق اشاعت فروخت کرنا چاہتے ہیں وہ اس پتہ سے خط و کتابت کریں:

منیجر "نگار" لکھنؤ

نگار

ایڈیٹر: سیار فتحپوری

جلد ۴۹	فہرست مضامین مئی سنہ ۴۶ء	شمار ۵

ملاحظات ---------- ۴

فانی کی شاعری کا دوسرا رخ ---------- ظہیر الدین احمد خاں ایم۔اے (علیگ) ---- ۹

مودودی نظریۂ امارت ---------- پروفیسر شوکت سبزواری ام۔اے ---------- ۲۰

گیت ---------- پریمی (علیگ) ---------- ۳۲

ایک شعبدہ گر سائنس داں ---------- ۳۶

باب الاستفسار ---------- ۳۹

باب الانتقاد ---------- محمد امین زبیری ---------- ۴۰

اہل چین کی چاء نوشی ---------- ۴۴

مومیائی کے سفوف سے علاج ---------- ۴۷

اندھیری دُنیا (نظم) ---------- پروفیسر شمس شیدائی سہسوانی ---------- ۵۰

خلاق کائنات سے (نظم) ---------- پروفیسر شور ---------- کلام شفقت کاظمی ---------- ۵۱

غزل ---------- احمد ندیم قاسمی ---------- کلام باسط بھوپالی ---------- ۵۲

سرسری تبصرہ ---------- ۵۳ تا ۶۲

ملاحظات

اتحاد ثلاثہ کی حقیقت

"اتحاد ثلاثہ" اس وقت ایک بین الاقوامی سیاسی اصطلاح ہے جس سے مراد، روس، برطانیہ اور امریکہ (دنیا کی تین بڑی طاقتوں) کا اتحاد ہے، لیکن جس طرح اور بہت سی سیاسی اصطلاحیں کوئی حقیقی مفہوم نہیں رکھتیں، بالکل اُسی طرح "اتحاد ثلاثہ" کی اصطلاح بھی سرمندۂ معنی نہیں۔

اگر اس اتحاد میں روس کے جگہ کوئی اور ڈماکریٹک حکومت ہوتی، تو شاید اس لفظ کا کوئی مفہوم پیدا ہو سکتا لیکن برطانیہ و امریکہ کا اتحاد روس کے ساتھ جس کے نظام حکومت کو انھوں نے ہمیشہ خوف و نفرت کی نگاہ سے دیکھا، اتنی عجیب بات ہے کہ اگر یہ اتحاد واقعتاً کبھی ہو بھی جائے تو اس پر یقین نہیں کیا جا سکتا۔

لڑائی کے دوران میں جب روس نے جرمنی کو پے در پے شکست دینا شروع کی، اسی وقت امریکہ و برطانیہ کے مفکرین سیاست کے سامنے یہ سوال بھی آیا تھا کہ دوران جنگ کے اس اتحاد ثلاثہ کو بعد از جنگ کیونکر قایم رکھا جا سکتا ہے اور اشتراکیت و ڈماکریسی کو کسی طرح ایک دوسرے کے لئے گوارا بنایا جا سکتا ہے، لیکن یہ معمہ اس سے زیادہ حل نہ ہو سکا کہ روس کی طرف سے جو بیزاری ڈماکریٹک حکومتوں میں پائی جاتی تھی اس کی شدت کو یہ کہکر کم کر دیا جائے کہ "روس کی طرف سے ہمارے خیالات اچھے ہیں، اہل روس کو ہم پسند کرتے ہیں اور بہت "نیک نیتی" کے ساتھ اس اتحاد کو قایم رکھنا چاہتے ہیں" لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ حقیقی امن و سکون نہ اس نوع کی پسندیدگی سے کبھی حاصل ہوا ہے، نہ محض نیک نیتی سے۔ ۱۷۷۶ء میں انگریز اور اہل امریکہ دونوں ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود مسلسل پانچ سال تک ان میں لڑائی جاری رہی۔

اس وقت امریکہ اور روس دونوں اظہار دوستی میں ایک دوسرے کا جام صحت پی رہے ہیں، لیکن ۲۲ء کی "واشنگٹن آرمس کانفرنس" میں امریکہ اور جاپان کے اتحاد میں بھی بالکل ایسا ہی جام صحت پیا گیا تھا اور اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔

الغرض بین الاقوامی اتحاد درحقیقت نہ "نیک نیتی" سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ معاہدوں سے بلکہ گفتار و کردار کے تطابق اور نیک نیتی کے عملی اظہار سے اور یہی چیز مفقود ہے۔

اُصولاً تو یہ بات طے ہو چکی ہے کہ متحدہ قومیں تمام کام ایک دوسرے کے مشورہ سے کریں گی لیکن عمل

اس پر نہیں ہوتا اور آپس کی بے اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ جو دل کی بات ہے وہ زبان تک نہیں آتی اور جو زبان سے کہا جاتا ہے اس پر بھی عمل نہیں ہوتا۔ اس لئے جب تک یہ بے اعتمادی دور نہ ہو اتحاد ناممکن ہے اور امن وسکون کی تمنا خواب پریشاں۔

سب سے بڑی غلطی اس باب میں یہ کی جارہی ہے کہ "امن وسکون" کے حصول کے لئے اب بھی اسی نظریہ سے کام لیا جارہا ہے، جس سے پچھلی جنگ میں کام لیا گیا تھا اور وہ یہ کہ بڑی بڑی طاقتیں خود ہی ساری دنیا کا امین ومتولی (Guardian) بننا چاہتی ہیں اور چھوٹی طاقتوں کو اپنے اثر میں لاکر ان کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہی ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہیں۔

بظاہر اس میں کوئی بدنیتی کی بات نہیں معلوم ہوتی، لیکن درحقیقت یہ بھی ایک قسم کا حملہ ہی ہے جس میں بجائے تلوار کے صرف مکر سے کام لیا جاتا ہے اور جس کا ہمیشہ ایک ہی نتیجہ ہوا ہے یعنی یہ کہ بڑی بڑی طاقتیں امن وسکون قایم کرنے کے بہانہ سے اپنے حلقۂ اثر کو زیادہ وسیع کرتی جاتی ہیں یہاں تک کہ یہ اثرات باہم دگر متصادم ہونے لگتے ہیں اور آخر کار لڑائی کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ ۱۴ء جنگ کا سبب بھی یہی ہوا تھا ۳۹ء کی لڑائی بھی اسی بناء پر ہوئی اور آیندہ جو آتش جنگ مشتعل ہونے والی ہے اس کی علت بھی یہی ہوگی۔

سب سے پہلے آپ روس کو لیجئے کہ وہ اپنے اثرات وسیع کرنے کے لئے کیا کر رہا ہے۔ تمام مشرقی وسطی یوروپ میں جسے سوویٹ حکومت نے بقول خود ناتسیت سے آزاد کرایا ہے، وہ ہر جگہ اشتراکی حکومتیں قایم کر رہی ہے ——— اور اس طرح تقریباً نصف درجن حکومتیں پولینڈ سے لیکر یوگوسلیویا تک سوویٹ اثر میں آچکی ہیں۔ وہاں کی پیداوار، وہاں کا صنعتی واقتصادی نظام، وہاں کی سیاست سب کی باگ ارباب ماسکو کے ہاتھ میں ہے اور اس طرح گویا یہ تمام حکومتیں سوویٹ حکومت کا جزو بن گئی ہیں۔ اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکہ وبرطانیہ نے ایسا کیوں ہوجانے دیا، کیا ان ملکوں کے آزاد کرانے میں برطانیہ وامریکہ نے کوئی مدد نہیں کی تھی اگر برطانیہ کے سمندری جہاز جرمنی کی ناکہ بندی نہ کرتے، اگر امریکہ وبرطانیہ کی ہوائی طاقت جرمنی کی صنعت گاہوں اور اسلحہ سازی کے کارخانوں کو تباہ نہ کرتی، اگر افریقہ، سسلی، اٹلی، فرانس اور بلجیم پر اتحادی حملے جرمن فوجوں کو سوویٹ محاذ کی طرف سے ہٹنے پر مجبور نہ کردیتے اور اگر امریکہ سامان حرب سے روس کی مدد نہ کرتا، تو کیا روس تنہا جرمنی کو شکست دے سکتا تھا — پھر سوال یہ ہے کہ امریکہ وبرطانیہ نے شروع ہی سے سوویٹ حکومت کے اس طرز عمل پر اعتراض کیوں نہیں کیا اور وسطی مشرقی یوروپ کی تقریباً چھ کروڑ غیر سوویٹ آبادی پر کیوں سوویٹ اثر قایم ہوجانے دیا

اس کا جواب بہت آسان ہے اور وہ یہ کہ اگر روس وسط یوروپ میں توسیع اقتدار کی پالیسی پر عمل کر رہا تھا تو امریکہ اور برطانیہ خود بھی دوسرے ملکوں میں توسیع اقتدار کی کوشش کر رہے تھے اور وہ روس کی نیت کا کھوٹ کیونکر ظاہر کر سکتے تھے جب کہ خود ان کی نیتوں میں بھی کھوٹ تھا۔

اگر رومانیا و بلغاریا میں سوویٹ اقتدار پر اتحادیوں نے خاموشی اختیار کی تو اس کا سبب صرف یہ تھا کہ وہ خود بھی یونان و اٹلی میں اسی پالیسی پر عمل کر رہے تھے۔

شام و لبنان لڑائی سے پہلے فرانس کے زیر اثر تھے، جب لڑائی شروع ہوئی تو فرانس کی آزاد حکومت نے ان کو آزاد کر دیا، لیکن جب لڑائی ختم ہونے پر فرانس نے دیکھا کہ دنیا میں پھر وہی تولیت و اقتدار والی پالیسی پر عمل ہو رہا ہے تو اس نے شام و لبنان کی آزادی چھین کر پھر اپنا تسلط جمانے کی کوشش شروع کر دی اور برطانیہ و امریکہ نے باوصف ہزاروں میل دور ہونے کے شام و لبنان کے مسئلہ کو ایک کانفرنس کے ذریعہ سے طے کرنے کی تجویز پیش کی اور روس کو اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی، حالانکہ روس کے موجودہ حدود اب شام و لبنان سے ۲۵۰ میل سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ امریکہ و برطانیہ کی یہ کوشش صرف اس لئے تھی کہ وہ حدود روس سے قریب اپنا اثر پیدا کریں اور اس کا جواب روس نے یوں دیا کہ ایران میں ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔

ایران کے پٹرولی چشموں پر برطانوی و امریکی کمپنیوں کا تسلط عرصہ سے قایم ہے، اور چونکہ ایران کی سرحد، روس سے ملی ہوئی ہے اس لئے اس نے امریکہ و برطانیہ کے اس تسلط کو ہمیشہ رشک کی نگاہ سے دیکھا، لیکن جب لڑائی ختم ہونے کے بعد اسے یہ معلوم ہوا کہ امریکہ، ایران سے مزید مراعات حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو وہ صبر نہ کر سکا اور اس نے آزربائیجان میں ہنگامہ برپا کرا کے ایران کی حکومت کو بھی بڑی حد تک اپنا موافق بنا لیا۔ گویا یہ جواب تھا اس بات کا کہ شام و لبنان کے مسئلہ میں اُس سے کیوں مشورہ نہیں کیا گیا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے، کیونکہ سوویٹ یونین کی سولہ ریپبلک حکومتیں وسط ایشیا میں پائی جاتی ہیں اور برطانوی ہند سے ان میں سے بعض کی سرحد بالکل ملی ہوئی ہے، ان ریپبلک حکومتوں میں سے ایک ازبک ریپبلک ہے جس کی آبادی ۷۰ لاکھ ہے اور پیداوار و صنعت کے لحاظ سے اس قدر ترقی یافتہ ہے کہ ترکی، ایران، افغانستان تینوں ملکر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے اگر ایران میں روس کے اثرات وسیع ہو گئے تو وسط ایشیا کی سوویٹ ریپبلکوں کو اس سے بڑی تقویت پہونچے گی اور برطانیہ خوب واقف ہے کہ اسٹالین کی دیرینہ تمنا یہی ہے کہ روس کا اقتدار تمام ایشیا پر قایم ہو جائے اور اگر ہندوستان آزاد نہ ہوا تو ایران پر روس کے اثرات قایم ہونے کے بعد اسٹالین کی اس دیرینہ تمنا کا پورا ہونا ناممکن نہیں ہے۔

الغرض یہ ہیں وہ اندرونی سیاسی پیچیدگیاں جنھوں نے اس وقت بین الاقوامی تعلقات کو ناخوشگوار بنا رکھا ہے اور یہ ہے تسلط و اقتدار میں ایک دوسرے سے بازی لیجانے کی موجودہ فضا، جو آیندہ جنگ کے امکانات کو روز بروز قوی بناتی جارہی ہے۔

روس اچھی طرح جانتا ہے کہ برطانیہ کو جب کبھی موقعہ ملا، ضرور روس کے خلاف ہتھیار اُٹھائے گا اور امریکہ بھی اس کا ساتھ دے گا، کیونکہ اشتراکیت کی وسعت کو ان کی سرمایہ دارانہ پالیسی کبھی گوارا نہیں کرسکتی، اسی طرح برطانیہ و امریکہ بھی بخوبی واقف ہیں کہ روس اپنے اثرات وسیع کرنے کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اُٹھا رکھے گا خواہ اس کا نتیجہ جنگ ہی کیوں نہ ہو اور یہ اندیشہ روز بروز اتنا قوی ہوتا جاتا ہے کہ ان میں سے کوئی اب یہ نہیں سوچتا کہ دنیا میں امن و سکون کیونکر قایم ہو بلکہ صرف یہ کہ آیندہ جنگ میں حربے و دفاع کی کونسی صورتیں زیادہ کامیاب ہوسکتی ہیں۔ ترکی کا مسئلہ ابھی تک طے نہیں ہوا اور حالات سے پتہ چلتا ہے کہ روس، ایران میں اپنے پاؤں جما لینے کے بعد ترکی سے اپنے مطالبات تسلیم کرانے کے لئے ضرور جارحانہ قدم اُٹھائے گا اور ہوسکتا ہے کہ یہی ابتدا ہو تیسری جنگ کی، جس میں حصہ لینے کے لئے برطانیہ کی فوجیں اب بھی کثیر تعداد میں ایران و ترکی کی سرحد پر مجتمع ہیں۔

بہرحال دنیا کی فضا پہلے سے زیادہ مکدر ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ مستقبل قریب میں کرۂ ارض کے کن کن حصّوں کو "آٹم بم" سے تباہ و برباد ہونا ہے۔

فراہمی کاغذ کی تازہ دشواریاں

اسوقت تک فراہمی کاغذ کی صورت یہ تھی کہ حکومت نے تمام اخبارات و رسایل کے لئے علٰحدہ علٰحدہ کاغذ کی ایک مقدار مقرر کردی تھی جسے کاغذ کا کوٹا کہتے ہیں اور خود ہی اس کی فراہمی کی ذمہ دار تھی، ہرچند کاغذ کی یہ مقررہ مقدار ضرورت کے لئے کافی نہ تھی، تاہم کسی نہ کسی طرح کام چل رہا تھا۔ مگر اب اس کاغذ کی فراہمی میں بھی دشواریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ جو کاغذ اس وقت تک استعمال ہو رہا تھا وہ معمولی قسم کا اخباری کاغذ تھا جو قبل از جنگ ناروے سے اور دوران جنگ میں کناڈا سے آتا تھا، لیکن اب جنگ ختم ہونے کے بعد کناڈا سے اس کی درآمد میں دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں اور حکومت اب تمام رسایل و اخبارات کو یہ کاغذ فراہم نہیں کرسکتی، اس لئے اس نے تجویز پیش کی ہے کہ جب تک کناڈا سے کاغذ کی درآمد کا سلسلہ باقاعدہ شروع نہ ہو۔ ماہانہ و نیم ماہانہ رسایل ہندوستان کی ملوں کا بنا ہوا سفید کاغذ استعمال کریں۔

یوں تو، اس میں شک نہیں کہ یہ تجویز بہت اچھی ہے، کیونکہ رسایل سفید کاغذ اچھی قسم کا استعمال کرنے لگیں گے، لیکن اسی کے ساتھ کچھ زحمتیں بھی ہیں، ایک یہ کہ سفید کاغذ کا کوٹا غالباً اتنا نہ ہوگا جتنا اخباری

کاغذ کا تھا اور دوسرے یہ کہ اگر کوٹا گھٹایا نہ جائے، تو بھی سفید کاغذ کی گرانی رسایل کو اس بات کی اجازت نہ دے گی کہ وہ اپنا موجودہ حجم قایم رکھنے کے لئے اتنے کثیر مصارف کا بار برداشت کریں۔

اخباری کاغذ جو اس وقت تک مل رہا تھا اس کی قیمت ساڑھے پانچ آنے فی پونڈ ہے اور سفید کاغذ کی قیمت آٹھ آنے فی پونڈ۔ یعنی اخباری کاغذ کا ایک ریم تقریباً ساڑھے سات روپیہ میں مل جاتا تھا اور اب سفید کاغذ کے لئے بارہ روپیہ فی ریم ادا کرنا ہوں گے، گویا کاغذ کا خرچ ڈیوڑھا ہو جائے گا، جس کو بہ مشکل برداشت کیا جا سکتا ہے۔

ابھی تک ہم کو اطلاح نہیں ملی کہ نگار کا ماہانہ سفید کاغذ کس مقدار میں دیا جائے گا، اس لئے ہم نہیں کہہ سکتے کہ نگار کا موجودہ حجم ہم قایم رکھ سکیں گے یا نہیں، لیکن اگر کاغذ کا کوٹا کافی نہ ملا جس کا اندیشہ ہے، تو ہم مجبور ہوں گے کہ نگار کے موجودہ حجم میں ایک جزو کی کمی کر دیں اور اس کمی کو اس طرح پورا کریں کہ مسطر ۲۹ سطر کا کر دیں، اس طرح مضامین کی کھپت تو پہلے سے زیادہ ہو جائے گی یعنی ۶۴ صفحات کے مواد کے بجائے ۶۴ صفحات کا مواد پیش کیا جا سکے گا، لیکن قلم باریک ہو جانے کی وجہ سے اس کے پڑھنے میں اتنی آسانی نہ رہے گی جتنی اس وقت پائی جاتی ہے۔ قارئین نگار کو یاد ہوگا کہ جنگ شروع ہونے کے بعد جب کاغذ کی فراہمی میں دشواریاں پیدا ہوئی تھیں، تو اس وقت بھی نگار کا حجم کم کر کے مسطر گنجان کر دیا گیا تھا، لیکن جب کاغذ زیادہ ملنے لگا، تو پھر وہی اصلی مسطر استعمال ہونے لگا اور حجم بجائے ۴۸ کے ۶۴ صفحات کر دیا گیا۔

اس وقت بھی بالکل وہی صورت سامنے ہے، اسلئے ممکن ہے آیندہ ماہ سے نگار کی کتابت ہم کو پھر گنجان کرنا پڑے — امید ہے کہ قارئین نگار، رسالہ کی خورد بینی کتابت کو اس وقت تک برداشت کریں گے جب تک یہ دشواریاں دور نہ ہوں اور اگر حکومت کا اندازہ غلط نہیں ہے تو یہ دشواریاں صرف چند مہینے کی ہیں۔

"نگار" کا جوبلی نمبر

۱۹۴۶ء کے ساتھ نگار کا پچیسواں سال ختم ہوتا ہے، اس خصوصیت کے ساتھ کہ اس دوران میں وہ ایک بار بھی بعد از وقت شایع نہیں ہوا، اور یہ کم مسرت کی بات نہیں۔ اس لئے خیال ہے کہ آیندہ جنوری ۱۹۴۶ء کا نگار جوبلی نمبر کی حیثیت سے شایع کیا جائے، لیکن اسکی تکمیل میں فی الحال دو باتیں حایل ہیں، ایک تو خود میری ذاتی پریشانیاں جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں، دوسرے کاغذ کی کمیابی جس کا ذکر ابھی ہو چکا ہے۔ تاہم میں سوچ رہا ہوں کہ ان دونوں مواقع کے دور کرنے کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں ذاتی حالات پر تو قابو نہیں اور نہ اس کا علم کہ آیندہ کیا ہونا ہے، لیکن کاغذ کی دشواری کا علاج ممکن ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۴۵ء کے سالنامے کی طرح ۱۹۴۶ء کا جوبلی نمبر بھی دو یا تین حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور پہلا حصہ دسمبر ۱۹۴۵ء ہی میں شایع کر دیا جائے۔ مزید تفصیل آیندہ اشاعت میں ملاحظہ سے گزرے گی۔

فانی کی شاعری کا دوسرا رُخ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

اس سے قبل جو کچھ عرض کر چکا ہوں اس سے ارباب ذوق نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ فانی کی زندگی انکی شاعری پر اور شاعری ان کی زندگی پر کہاں تک اثر انداز ہوئی ہے۔ فانی کی زندگی ان کی شاعری ہے ان کی ادبی اور مادی زندگی ایک ہی ہے۔ فانی نے اپنے حواس باطنی سے اپنی زندگی کی حقیقی قدروں کو اُجاگر کیا خارجی زندگی ان کی داخلی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ یہی حواس باطنی ان کی شعری صلاحیتوں کی محرک ہوئی ہے، جس میں غم کی چاشنی کافی سے زیادہ ملتی ہے۔

غم فانی کے یہاں کبھی سراپا زندگی ہے، اور کبھی شدت احساس کا دوسرا نام، غم سے کبھی وہ عشق کے شدید جذبات کی مصوری کرتے ہیں اور کبھی وہ غم ہی کو حُسن کے لئے ضروری سمجھتے ہیں کبھی وہ فلسفہ کے بڑے سے بڑے دقیق مسئلہ کو بھی غم ہی کے ذریعہ حل کرتے ہیں۔ مختصراً غم ان کی شاعری میں ہر جگہ جاری و ساری ہے۔ دیر ہو یا حرم غم ہر جگہ ان کا ہم سفر ہے اور اسی شکل میں ان کی زندگی گزرتی ہے۔

دیر میں یا حرم میں گزرے گی　　عمر تیرے ہی غم میں گزرے گی　　(فانی)

اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان کی زندگی میں مسرت کا کوئی لمحہ آیا ہی نہیں۔ کبھی کبھی ان کی زندگی کا بھی ستارۂ سحری چمکا لیکن تھوڑی دیر کے بعد ماند پڑ گیا۔ غم ان کی فطرت ثانیہ بن گیا ہے۔ وہ مسرت کو ایک عارضی شے سمجھتے ہیں اور غم ان کے یہاں ایک مستقل حقیقت کا نام ہے۔ زندگی کو وہ غم کا مترادف سمجھتے ہیں اس لئے کسی طرح ان پر یہ الزام لگانا جایز ہی نہیں ہے کہ ان شاعری برائے زندگی نہ تھی۔ انسان کی سب سے بڑی شکست اس کی موت ہے، زندگی کا ماحصل غم ہے اور غم ہی پر زندگی کا خاتمہ ہے۔

فانی صرف شاعر ہی نہ تھے بلکہ انسان بھی تھے۔ ہماری اور آپ کی طرح ان کو بھی پیٹ پالنا پڑتا تھا۔ اگر "عقدہ حیات میں ان کو شبستان عیش نظر" نہ آیا اور "سوز محبت ان کے ہر بن مو کو برق سرطور کی شرر افشانیوں کا گہوارہ" نہ بنایا اور "عشق کی انہی ناکامیوں میں ان کو وہ سرور حاصل نہ ہوا کہ ان کی ہر موج نفس موج صہبا بن جاتی" تو اس میں ان کا کیا قصور ہے اگر نقاد فانی سے اس قسم کا مطالبہ کرتے ہیں تو ان کی بھول ہے شاعر فطرتاً

آزاد ہے۔ جس چیز کو وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اس کو اچھے اور دلکش پیرایہ میں بیان کر دیتا ہے۔ اسکے بعد اس کا کام ختم ہو جاتا ہے۔ نقاد اپنے نظریوں کو شاعر کے ساتھ کیوں وابستہ کرتے ہیں۔ بہت ممکن ہے ہمارے اور آپ کے نظرئے میں فرق ہو۔ ہم ایک چیز کو ایک صورت سے دیکھتے ہوں اور آپ کا نقطہ نگاہ اس سے مختلف ہو شاعر پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ اس نے زندگی کے آلام کو ہنستے اور کھیلتے کیوں نہیں برداشت کیا کیوں اسنے مصیبتوں میں آہ کھینچی؟ کیوں نہیں گھٹ گھٹ کے مرگیا؟۔ پروفیسر آل احمد سرور ایک جگہ لکھتے ہیں "جو لوگ یہ کہکر فانی کی عظمت کو کم کرنا چاہتے ہیں کہ اس میں سوائے رونے اور بسورنے کے اور کچھ بھی نہیں ہے، وہ سطحی تنقید کرتے ہیں فانی نے زندگی اور موت دونوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر ان کے چہرے سے نقاب اُٹھایا ہے۔ انھوں نے موت سے اس کی ہیبت اور پر اسرار کیفیت چھین لی ہے اور اسے زندگی کی طرح گوارا بنا دیا ہے۔۔۔۔ فانی کے یہاں غم ہے تو غم کا عرفان بھی ہے۔ وہ ان شعرا میں سے نہیں جو تلخیِ حیات سے گھبرا کر جام مے یا آغوش محبوب میں پناہ لیتے ہیں"۔ بہت سے شاعر ایسے ہیں جو زندگی میں تماشہ گر کی حیثیت سے نہیں بلکہ تماشہ بین کی حیثیت سے آتے ہیں خون کی ہولی کی دعوت دیتے ہیں اور دور سے اس کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ فانی ان شعرا میں سے نہیں ہیں وہ خود تماشہ کی صورت میں نظر آتے ہیں اور اپنی زندگی کو من وعن اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں۔ جیسا کرتے ہیں ویسا ہی کہتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری ایک جگہ لکھتے ہیں "فانی کے وہاں جو سوز و گداز ملتا ہے اسے مرثیت سے دور کی بھی نسبت نہیں ہے جو عزیز کے یہاں ساری فضا پر چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے، فانی کی غزلوں میں اُداسی ہوتی تو ضرور ہے مگر یہ اُداسی گہری اور پر تامل ہوتی ہے"۔ پھر آگے چلکر لکھتے ہیں "غالب کے بعد اگر اقبال سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر لیا جائے تو اُردو غزل میں فانی پہلے شاعر ہیں جن کے کلام میں شروع سے آخر تک کلیماً بصیرت کا احساس ہوتا ہے ان کے وہاں جذبات و واردات فکر و تامل کے احاطہ سے گزر کر ہم تک پہونچتے ہیں اور ان کی درد مندی ہم کو کسی حکیم یا عارف کی درد مندی معلوم ہوتی ہے۔ فانی کے تغزل کو ہم میر و غالب کا ایک کامیاب امتزاج کہہ سکتے ہیں"۔ یہی واردات و جذبات ہیں جن کو ہم سب محسوس کرتے ہیں لیکن فکر و تامل کے احاطہ سے نکال کر دوسروں تک نہیں پہونچاتے۔ شاعر اسکو محسوس کرتا ہے اور اپنے خونِ جگر سے اس کو سینچ کر لفظوں کا جامہ پہناتا ہے اور جب وہ جامہ زیب واردات و جذبات ہمارے سامنے آتے ہیں تو ہم کہہ اُٹھتے ہیں کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے، اسوقت ہم ایک محض انسان اور ایک انسان شاعر میں فرق کرتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری فانی کا مقابلہ انگریزی کے مشہور یاس انگیز شاعر A.E. Housman سے کرتے ہیں کیونکہ جو حزن و یاس Housman کے یہاں پایا جاتا ہے وہ مابعد الطبیعیاتی تصور لئے ہوئے ہے اور اس کی قنوطیت ایک حکیمانہ توازن لئے ہوئے ہوتی ہے۔ اسی طرح فانی کے یہاں بھی ہمیں

ایک مردانہ تحمل اور خود دارانہ بے نیازی کا احساس ملتا ہے - جو دوسرے اُردو کے یاس انگیز غزل گو شعرا کے یہاں نہیں ملتا -

فانی کی شاعری پر ایک اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے موضوع کا دائرہ بہت تنگ ہے - فانی نے زندگی کو مختلف طریقوں سے بسر کرنا چاہا، لیکن ان کی زندگی ان کی تمام کوششوں کے باوجود ایک ہی طرح پر گزری - وہ لاکھ تدبیر کرتے تھے لیکن تقدیر کے سامنے سپر ڈال دینا پڑتا تھا - اسی وجہ سے ان کے یہاں زندگی کا ایک ہی پہلو ہے یعنے غم کا پہلو - لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ فانی غم کو زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے اور انکے یہاں غم زندگی سے اور زندگی غم سے عبارت ہے -

نیاز فتحپوری صاحب ایک جگہ رقمطراز ہیں :

" فانی نے تغزل میں جو جگہ اپنے لئے پیدا کرلی تھی وہ حسرت کی طرح انہی کے لئے مخصوص تھی بہت سے لوگوں نے ان کی تقلید کرنا چاہی لیکن کامیاب نہ ہوئے - فانی کی غزل گوئی ان کے شدید اور تلخ احساس کی زبان تھی جسمیں دوسرا شاعران کا ہمسر نہ تھا - ان کے بیان غم میں کوئی چیخ نہ تھی بلکہ ایک دلدوز نشتر کی سی کیفیت تھی جو اندر ہی اندر پیوست ہوتا چلا جاتا تھا "

یہی دلدوز نشتریت فانی کے ہر شعر میں ملے گی - عشق و محبت اور فلسفہ میں فانی اسی سے کام لیتے ہیں یہی ان کی مقبولیت کی سب سے پہلی دلیل ہے - جو شخص ان کے اشعار کو پڑھتا ہے دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی پر یہ واقعہ گزرا ہے - اسی موقع کے لئے کہا گیا ہے کہ " دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے "

کلیم الدین صاحب جو ہر اُردو شاعر پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں، مگر فانی کی جذبات نگاری کے قایل دکھائی دیتے ہیں، کلیم الدین صاحب کا خیال ہے کہ فانی ایک طرف غالب کے زیر اثر فلسفیانہ خیالات کو نظم کرتے ہیں اور دوسری جانب جذبات نگاری اپنا شعار قرار دیتے ہیں - معنی آفرینی کو کلیم الدین صاحب ارادی سمجھتے ہیں لیکن جذبات نگاری کو فطری - فرماتے ہیں :-

" فانی کی لغت میں زندگی اور غم مترادف الفاظ کی حیثیت رکھتے ہیں - " غم جاوداں " ان کی زندگی ہے انھیں دکھا ہوا دل عنایت ہوا ہے، وہ اسی زندگی اسی " غم جاوداں " اسی دُکھے ہوئے دل کی تشریح کرتے ہیں اور اپنی زندگی میں زندگی انسان کو منعکس دیکھتے ہیں، اس لئے ان کی دنیا غم سے مملو نظر آتی ہے "

فانی نے غم میں مسرت کی بھی جھلکیاں دیکھی ہیں - انھیں غم و الم میں ایک خاص مسرت حاصل ہوتی ہے فانی صرف وجود درد اور درد کے علاج ہی کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ اس حقیقت کا علم انھیں مسرت بخشتا ہے - فانی زخم دل کی دوا نہیں چاہتے وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ زخم دل بھر نہ جائے اور اس طرح جو ایک مستقل مسرت ان کو

حاصل ہوتی ہے وہ یکلخت کم نہ ہو جائے اور زندگی کے جتنے سوتے ہیں سب یکلخت بند نہ ہو جائیں۔

ہاں ناخن غم کمی نہ کرنا ڈرتا ہوں کہ زخم دل نہ بھر جائے

اس لئے وہ اس کی تلقین کرتے ہیں:-

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر ہمت ہو تو بے قرار ہو جا،

فانی کے نزدیک بے قرار ہو جانا اور غم کی جستجو کرنا ہمت والوں کا کام ہے۔ اس لئے وہ دوسروں کو غیرت دلاتے ہیں وہ رونے اور بسورنے کے بجائے تکلیفوں اور آہوں کا خوگر بناتے ہیں۔ اور خود کو اسی کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں

فانی نے عشق کی تعریف مختلف طریقوں سے کی ہے۔ کہیں حُسن کی تعریف سے، کہیں انکسار محض سے، کہیں احساس خودی سے اور کہیں محض غم آرزو سے۔ فانی نے عشق کے صدمات سہے اور اس میں ناکام رہے اس لئے عشق میں رسوائی ان کے لئے بہت ضروری ہے وہ محبت کی وادی میں ایک رہرو گم کردہ راہ کی طرح بھٹکتے رہتے ہیں آخرکار "غرور عجز" ان کی فطرت بن جاتا ہے یہی "غرور عجز" بڑھتا بڑھتا ان میں احساس خودی کا مادہ پیدا کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں:

میری وفا، جفا فروش گر یہ تبسم آفریں عشق کی ساری کائنات صرف جمال ہو گئی

عزت رسوائی بھی کہیں تدبیر سے حاصل ہوتی ہے حیف ہے اسکی قسمت پر جو عشق میں رسوا ہو نہ سکا

عشق کی دنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

اللہ رے اعتماد محبت کہ آج بھی ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کئے بغیر

کب تک رہینِ ذوق تماشہ رہے کوئی اب وہ نگاہ دے کہ تماشہ کہیں جسے

فانی کے یہاں سپردگی اور احساس حسن کافی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں ایک کسک، ایک تڑپ اور ایک خلش پائی جاتی ہے۔ شاید اسی کو وہ زندگی کی تمام پونجی سمجھتے ہیں غرور عجز کے سلسلہ میں چند شعر سن لیجئے:

تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

جی ڈھونڈھتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور اس آپ کی زمیں سے الگ آسماں سے دور

چن لیا تیری محبت نے مجھے اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی،

مرے شوق نے سکھایا اسے شیوۂ تغافل نہ مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا،

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا مگر منجملۂ آداب غمخواری ہے غم میرا

فانی کی مجازی محبت کی حدیں حقیقت تک جا پہونچی ہیں۔

وادیٔ شوق میں وارفتۂ رفتار ہیں ہم ، بے خودی کچھ تو بتا کس کے طلبگار ہیں ہم
آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے ، تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز ،
صور و منصور و طور ارے توبہ ، ایک ہے تیری بات کا انداز

فانی نے "جوانی کے صدموں" سے متاثر ہوکر صرف عشق و محبت ہی کو اپنی شاعری میں جگہ نہ دی بلکہ فلسفے کی گتھیوں کو بھی سلجھایا ہے۔ فانی کی شاعری کا دوسرا موضوع جبر ہے، صوفیائے اسلام کے یہاں اس پر تین رائیں ملتی ہیں۔ انسان محض مجبور ہے اس کا کوئی فعل اور اس کی کوئی حرکت اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ کوئی طاقت اس "پردۂ زنگاری" میں اس سے ہر کام کرواتی ہے جس کو جبر کہتے ہیں اور اس کے ماننے والے جبریہ کہلاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ خدا نے ہمیں پیدا کیا وہ ہمارا خالق ہے، مگر ہم اپنے افعال کے خود محرک ہیں اور اپنے حرکات و سکنات کے خود خالق ہیں۔ خدا کو ہمارے افعال سے کوئی سروکار نہیں، اس عقیدہ کا نام قدر ہے اور اس کے ماننے والوں کو قدریہ کہتے ہیں۔ تیسرا عقیدہ بین الجبر والقدر ہے، یعنے ہمارا اور ہمارے افعال کا خالق خدا ہے۔ لیکن اپنے افعال کے ہم خود مختار ہیں اسی پر اقبال نے بھی بہت زور دیا ہے۔ "ایمان، درمیان جبر و قدر بہت" کہا ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ پیہم ناکامی اور مایوسی ایک مفکر یا شاعر کو صبر کی طرف کھینچتی ہے انسان اپنے لئے کامیابی کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن اس پر بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس منزل پر پہونچکر اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ انسان محض مجبور ہے اور اپنے افعال و حرکات کا وہ مختار نہیں ہے بلکہ اس کا خالق خدا ہے۔ تو وہ جبر کی طرف جھکتا ہے۔ اور اپنے تمام افعال کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ مشرقی شعراء میں روحانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اگر یہ روحانیت ایک طرف شاعری کے لئے سم قاتل کا کام کرتی ہے تو دوسری طرف شاعری کو چار چاند بھی لگاتی ہے۔ یہی روحانیت ہمارے مشرقی شعراء میں اس درجہ رچی ہوئی ہے کہ ایک خاص صنف بنگئی اور اس روحانیت کے لئے گداز دل اور مایوس زندگی بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے ہمارے اردو شعرا نے تصوف کا ورثہ فارسی شعرا سے پایا ہے۔ اس جگہ اگر تصوف کے بارے میں کچھ بیان کیا جائے تو بے محل نہ ہوگا۔ تصوف کیا ہے؟ تصوف صوف سے مشتق ہے جس کے معنے پشمینے کے ہیں چونکہ ایک زمانہ میں گلیم اور پشمینہ پوش بزرگ خدا کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ اس لئے تصوف ان بزرگوں کی کیفیت کو کہتے ہیں۔ صوفی خدا کی ذات میں اپنے آپ کو گم کرنا اپنا منتہا سمجھتا ہے۔ پیغمبر خدا کے لئے اس کے بندوں میں رہنا ضروری سمجھتا ہے۔ پیغمبر کا کام صوفی کے کام سے مشکل ہے۔ اسلام کے دور اول میں للّٰہیت، خشوع و خضوع، جذب و شوق ان سب پر علی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری میں صوفیائے کرام کا کوئی

مخصوص گروہ یا اصطلاح نہ تھی، اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے ایک طرف تدبر اور تفکر پر زور دیا دوسری طرف یقین و ایمان کے لئے وجدان اور باطنی شعور کو بھی ضروری قرار دیا۔ امام مالک کا قول ہے کہ "جو شخص صوفی ہوا اور فقیہ نہ ہوا وہ گمراہ ہوا اور فقیہ ہوا صوفی نہ ہوا وہ فاسق ہوا اور جس نے ان دونوں کو جمع کیا وہ محقق ہوا" شروع میں تصوف یا طریقت شریعت سے علٰحدہ نہ رہی۔ حضرت جنید کے زمانہ میں عشق الٰہی میں ایک ایسا سوز و گداز پیدا ہوا جس کی وجہ سے بعض بزرگوں نے دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ابو سعید بن ابی خیر اور ابو الحسن وظائف میں مشغول ہونے کے بجائے فنا پر زور دیتے تھے۔ محی الدین کے زمانہ سے تصوف فلسفہ بنا اور اس میں وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا گیا۔ اس نظریہ سے جہاں حریت و مساوات انسانی کا تصور عام ہوا وہاں دنیا کے فریب اور اس کے اعتباری اور موہوم ہونے پر بھی زور دیا گیا۔ یہ مسلک صوفیوں کو عملی زندگی سے علٰحدہ لے گیا۔ مگر اس کے باوجود تصوف نے اشاعت اسلام اشاعت علوم اتحاد و یگانگت پھیلانے میں مسلمان فاتحوں سے زیادہ کام کیا ہے۔ مجدد الف ثانی نے شریعت اور طریقت میں بڑھتی ہوئی خلیج کے پاٹنے کی کوشش کی۔ اور وحدت الوجود کے بجائے وحدت الشہود پر زور دیا۔ اس کا عملی پہلو یہ تھا کہ تصوف کو پھر زندگی اور مذہب کی طرف لایا جائے۔ شاہ ولی اللہ نے محی الدین اور مجدد الف ثانی دونوں کے نظریوں کو ملایا ہے اور وحدت الوجود کے مثبت پہلو پر زور دیکر عام انسانیت کو یکجا کرنا چاہا ہے۔ تصوف کی شاعری مسلمانوں کے دور انحطاط کی پیداوار ہے۔ تصوف جب برہمنیت کی طرف مایل ہوتا ہے تو ایک قسم کی افیون ہو جاتا ہے اس لئے اقبال نے اسرار خودی میں افلاطون کو "گوسفند از گوسفندان قدیم" کہا ہے اور حافظ کی شاعری کو ایک نشہ قرار دیا ہے۔ فارسی شعرا کی وساطت سے اُردو شعرا میں بھی تصوف کا یہی رنگ آیا۔ اسلام نے اس عقیدہ کی اس طرح تصحیح کی کہ عالم غیر حق نہیں ہے بلکہ اپنا عرفان خدا کا عرفان ہے۔ اقبال اس کو یوں ادا کرتے ہیں:

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی ، تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن ،

اقبال اس کو خودی سے منسوب کرتے ہیں۔ "فلسفیانہ مباحث سے قطع نظر کر کے یہ ماننا پڑتا ہے کہ شاعرانہ آرٹ کے اعتبار سے فانی کا مرتبہ بہت بلند ہے"۔ اس مسئلہ کو کس خوبی سے فانی نے بیان کیا ہے:-

یہ جستجو ہی کہ ہے عالم مجاز کہاں تلاش چشم حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی میں بیان کر رہا تھا کہ فانی کی شاعری کا دوسرا موضوع جبر ہے۔ فانی کا یہ موضوع بہت محبوب ترین موضوع ہے بعض شعرا نے اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے لیکن اس میں تکلف اور تصنع کی بو آتی ہے فانی کے یہاں صداقت اور خلوص پایا جاتا ہے۔ انھوں نے کبھی ادب کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔

اب چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :-

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں،
فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں
دنیا میں حال آمد و رفت بشر نہ پوچھ — بے اختیار آکے رہا بے خبر گیا
گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل — غریب کشمکش جبر و اختیار میں ہے
مجھ پہ رکھتے ہیں حشر میں الزام — آنہ جائے زباں پہ تیرا نام،
جسم آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح — خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں
وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی — دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہ گار ہیں ہم
امید عفو ہے ترے انصاف سے مجھے — شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا
مختار ہوں کہ معترف جبر دوست ہوں — مجبور ہوں کہ یہ بھی کوئی اختیار تھا،
محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا — آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

پہلے شعر میں شاعر نے یہ دکھلایا ہے کہ ہمارا وجود محض فرضی ہے اور اس لحاظ سے ہم اپنے افعال کے مختار نہیں ہیں لیکن ہمیں اختیار کی ایک شکل دیدی گئی ہے گویا ہم قید ہیں لیکن زنجیر ہمارے پیروں میں نظر نہیں آتی۔ یہاں قوت ارادی اور قوت اجتنابی میں رسہ کشی ہو رہی ہے۔ آخر کار قوت اجتنابی غالب آتی ہے۔

دوسرے شعر میں بھی وہی معنی پنہاں ہیں۔ انسان کے افعال و حرکات خدا کے اختیار میں ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے افعال کے خود مختار ہیں۔ تیسرے شعر میں فانی تقدیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور چوتھے شعر میں فانی انسان کو قضا و قدر کے ہاتھوں میں گرفتار پاتے ہیں۔ وہ ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہے، نہ تو اسے اپنے افعال پر اختیار ہے اور نہ اپنے حرکات پر "رحم کے قابل" کے ٹکڑے میں فانی نے جان ڈالدی ہے۔

پانچویں شعر میں کس آہستگی اور نرمی سے فانی اپنے کو تمام الزامات سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں :-

"آنہ جائے زباں پہ تیرا نام" کا ٹکڑا اشاروں اشاروں میں سب کچھ بتلا دیتا ہے۔ چھٹے شعر میں :-

"خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں" سہل ممتنع کی حد تک پہونچ چکا ہے۔ یعنے وجود کو جو عالم غیب میں آزاد تھا عالم شہادت میں لاکر مقید کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اور ہمارا عمل کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو کچھ ہو تم ہو۔

ساتویں شعر میں قریب قریب یہی معنے ہیں۔ "ہوش میں آنے" سے مراد وجود کا عالم غیب سے جدا ہو کر قید تعین میں اسیر ہونا ہے۔ ساتویں شعر میں فانی نے یہ دکھلایا ہے کہ تمام افعال خیر و شر کا فاعل حقیقی تو وہی ہے۔ انسان کا وجود محض ایک پردہ ہے۔ اور وہ محض ایک آلۂ کار کی حیثیت رکھتا ہے جب انسان کی یہ حیثیت ہے تو

اس کے گناہوں کے ارتکاب پر جس میں اس کے اختیار کو قطعاً دخل نہیں تھا سزا نہ دیجائے گی۔ نویں شعر میں فانی نے ایک نئے اختیار کو ثابت کیا ہے۔ یعنے "جبر دوست" کا اعتراف کرلینا میرے اختیار میں ہے لیکن بھلا یہ بھی کوئی اختیار ہے، آخیر دیں شعر میں سزا بھگتنے نہیں گئے ہیں بلکہ محشر میں اختیار کی اس تہمت کی داد لینے گئے ہیں جو ان پر لگائی گئی ہے۔

یہ آفاقی نظر اور خیالات کی گہرائی اور رنگ تغزل اُردو میں کیا بلکہ فارسی شعرا کے یہاں بھی کم ملتا ہے ان اشعار کے پڑھنے سے فانی کی خاص انفرادیت جھلکتی ہے۔

فانی تدبیر کا دامن بھی پکڑے ہوئے ہیں وہ زندگی بھر تدبیروں سے کام لیتے رہے لیکن پیہم شکست اور ناکامی نے تدبیر کا دامن چھڑا کر تقدیر کے سایہ میں لا بیٹھا دیا۔

حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے راز تقدیر الٰہی کو نہ پوچھ

اگر "تقدیر الٰہی" ظاہر ہو گئی تو تدبیر کا بنا بنایا کام بگڑ جائے گا۔

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو جا رہا ہے اک جنازہ دوش پر تقدیر کے

یہاں تقدیر سے تدبیر کی شکست ہوتی ہے۔

بس ان پہ نہ انکی یاد پہ ہو تقدیر کے کیا کیا پہلو ہیں تدبیر سے حاصل کچھ بھی نہیں تدبیر سے غافل کوئی نہیں

بس یہی تقدیر کا ایک پہلو ہے کہ "وہ" لازماً یاد آتے ہیں۔

الٰہی کیا خبر لاتا ہے قاصد وصل دلبر کی بلائیں لے رہی ہیں میری تدبیریں مقدر کی

یہاں پر شاعر اپنی تدبیروں کو کچھ پھلتا پھولتا دیکھتا ہے لیکن پھر وہ چلا اُٹھتا ہے۔

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر کیا یہ ساری عمر منہ تکتی رہیں تقدیر کا

مسئلہ جبر و قدر کی طرح عقیدہ وحدت الوجود بھی اُردو شاعری کا ایک جزو ہے۔ اُردو شاعری میں میر درد، غالب اور فانی اور اس سے بہتر اقبال نے اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھا۔ لیکن یہ شعرا پوری طرح اس مسئلہ پر متفق نہیں ہیں۔ اس پر سب متفق ہیں کہ اصل کائنات ایک ہستی واحد ہے۔ خواہ اس کو ایتھر کہہ لیجئے یا عقل اول یا نور مطلق سے تعبیر کر لیجئے یا مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اسے خدا سمجھ لیجئے اس پر تمام مذاہب کی مقدس کتابیں متفق ہیں سوائے ان "بریانی والے ملاؤں" کے جن کی نظر مادیت سے بلند نہیں ہوتی لیکن جب ہم عالم پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بنیادی اختلافات نظر آتے ہیں عام نظریہ یہ ہے کہ عالم محض خواب و خیال ہے۔ ویدانت، ایرانی تصوف عیسائی اور ان سے پہلے کے محققین اور حکمائے یونان سب کا یہی خیال ہے کہ عالم محض خواب و خیال ہے اسلئے ایرانی شعرا اور ان کے مقلد اُردو شعرا بھی اکثر اسی خیال کے پیرو نظر آتے ہیں۔ غالب کس یقین کے ساتھ کہتے ہیں:-

ہاں کھائیو مت فریب ہستی، ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

فانیؔ بھی اسی خیال کو ایک دوسرے انداز سے بیان کرتے ہیں:

ہے کہ فانیؔ نہیں ہے کیا کہئے، راز ہے بے نیاز محرم راز
ہر مژدۂ نگاہ غلط جلوہ خود فریب عالم دلیل گمرہی چشم و گوش ہے

غالبؔ کے یہاں قطعیت ہے اور فانیؔ کے یہاں تشکک پایا جاتا ہے لیکن یہ تشکک کہیں زیادہ خوشگوار اور خوش آئند ہے۔ غالبؔ کا ایک مشہور شعر وحدت الوجود پر ملاحظہ ہو:-

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

لیکن غالبؔ قطعیت سے ہٹ کر تشکک کی راہ پر آجاتے ہیں جبکہ وہ کہنے لگتے ہیں:-

"یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟" "ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟"
جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اب فانیؔ کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجئے:-

مرا وجود ہے میری نگاہ خود نشناس وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا،

کچھ نہ وحدت ہے نہ کثرت نہ حقیقت نہ مجاز یہ ترا عالم ہستی وہ ترا عالم ہوش،

ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم، میری ہستی ہے غیب کی آواز،
نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

تیسرے شعر میں انسانی زندگی کا محض منفی پہلو ہی نہیں دکھلایا گیا ہے بلکہ ایجابی اور روشن پہلو پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، حقیقت انسانی کے مافوق الادراک ہونے کا فلسفہ اس سے اچھے پیرایہ میں شاید ہی بیان ہوا ہو۔

جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے کہ فانیؔ کے یہاں زندگی کا قنوطی تصور ہے وہ زندگی کو ناکامیوں اور مایوسیوں کا آماجگاہ سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی میں درد ہی درد ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ان کے نزدیک زندگی ایک معمہ ہے جس کو نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ انسان محض مجبور ہے اس لئے زندگی رو رو کر اور مر مر کے گزرنے کا نام ہے۔ وہ زندگی اور موت میں کوئی فرق نہیں کرتے، زندگی کو وہ ایسی منزل سمجھتے ہیں جس میں نہ تو کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی رہبر انسان اس دنیا میں کس بیبسی کی حالت میں رہتا ہے نہ تو اس دنیا میں اپنے اختیار سے آتا ہے اور نہ اپنے اختیار سے جاتا ہے، زندگی غم سے عبارت ہے

اور اسی غم کی جستجو کرنے سے زندگی کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی — وجود درد مسلم علاج نامعلوم

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

زندگی صبر ہے اور صبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی — زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

زندگی جادۂ بے منزل ہے — مسلک رہبر و راہی کو نہ پوچھ

فانی کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب — موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہئے تھا

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدار — زندگی آہ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

اس لئے وہ انسان کی ہستی کو محض پانی کا بلبلا سمجھتے ہیں وہ ہستی کو خواب پریشاں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے انسان کی ہستی ہمیشہ امید و بیم کے محور پر گھومتی رہی۔ اور انسان کی موت جادہ ہستی کی آخری کڑی ہے۔

گو ہستی تھی اک خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی — چونک اُٹھتے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

امید و بیم پہ ہے ہستی بشر موقوف — کہ جا کے دم پلٹ آتا ہے دل دھڑکتا ہے

دیکھ یہ جادۂ ہستی ہے سنبھل کر فانی — پیچھے پیچھے وہ دبے پاؤں قضا بھی آئی

زندگی کی تنقید میں فانی نے سب سے زیادہ حکیمانہ انداز اختیار کیا ہے اور حقیقت کو فلسفیانہ خیالات سے واضح کیا ہے کبھی کبھی ہلکے اور لطیف کنایات اور اشارات سے پورا پورا مفہوم ادا کیا ہے احساس غم اور ادراک غم کو عین زندگی سمجھا ہے اور اسی غم میں وہ زندگی کی ابدی مسرتیں اور مسرتوں کے دھارے پنہاں دیکھتے ہیں اور غم سے غم اخذ کرنا گناہ سمجھتے ہیں حسن و زندگی ان کے یہاں لازم و ملزوم ہیں۔ حُسن و زندگی کے تضاد سے جو چنگاری نکلتی ہے وہ غم ہے اور اسی غم کو وہ حیات جاوید سمجھتے ہیں۔

فلسفہ بیان کرتے وقت فانی ایک خشک فلسفی نہیں رہتے بلکہ انتہائی شگفتگی کے ساتھ اس کو بیان کرتے ہیں، ان کے بیان میں کرختگی ذرا بھی نہیں پیدا ہوتی۔ ان کے یہاں ایک عجیب قسم کی دل موہ لینے والی کیفیت ملتی ہے جس کے ذریعہ وہ بڑے سے بڑے مسایل کو اس آہستگی، نرمی اور خوش اسلوبی سے بیان کر جاتے ہیں کہ اس کا دل پر نقش اُتر جاتا ہے۔ ان کا بیان شعریت سے آراستہ ہوتا ہے زبان بہت صاف اور میٹھی ہے۔ فانی اپنی غزلوں میں انسانی نفسیات کا بھی تجزیہ کرتے ہیں۔

ترک امید بس کی بات نہیں — ورنہ امید کب بر آئی ہے

جب ترا ذکر آگیا ہم دفعتاً چپ ہو گئے — وہ چھپایا راز دل ہم نے کہ افشا کر دیا

یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اس نے کہا کہئے — تو چپ میں کہ کیا کہئے کھلتی ہے زباں کوئی

فانی بعض بعض جگہ مصوری بھی کرتے ہیں صرف چند اشاروں پر وہ اکتفا کرتے ہیں ایک مخصوص ادا ایک مخصوص منظر اور ایک مخصوص تیور کی تصویر اشاروں اشاروں میں ہمارے سامنے کھینچ دیتے ہیں۔

یوں چرالی اس نے آنکھیں سادگی تو دیکھئے — بزم میں گویا میری جانب اشارہ کر دیا

فانی کا انداز بیان ان کو دوسرے شعرا سے علٰحدہ کرتا ہے۔ یہ ان کی ممتاز خصوصیت ہے مومن کا بھی ایک خاص انداز تھا۔ جس طرح مومن اپنے انداز بیان کی وجہ سے یاد کئے جائیں گے اسی طرح فانی بھی اپنے انداز بیان کی وجہ سے زندہ رہیں گے۔

حشر میں حشر چاہئے حشر پہ حشر چاہئے — دفن ہے سجدہ ہائے شوق ناصیہ نیاز میں

آنسو تھے سو خشک ہوئے جی ہے کہ امڈا آتا ہے — دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

فانی کا ہر شعر قریب قریب شعریت اور معنویت کے لحاظ سے آراستہ ہے۔ بعض خیالات پرانے ہیں۔ لیکن پرانی شراب نئی بوتل میں نت نئے روپ سے آئی ہے۔ آرٹ کی انتہائی خوبی اس کے پوشیدہ رہنے میں ہے۔ فانی کے یہاں اشارے کافی ہیں غالب بھی اسی آرٹ کو پسند کرتے تھے۔

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے — میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہونچی تری جوانی تک

فانی کے معاصرین میں سے بہت کم ایسی ہستیاں ہیں جو خود اپنا مستقل وجود رکھتی ہوں، فانی، غالب، میر اور درد کی تقلید نہیں کرتے بلکہ اپنی انفرادیت اور اپنے وجود کو باقی رکھتے ہیں، نہ تو ان کی شاعری کو تصنیفات سے آراستہ کہا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کی شاعری سرقہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انکے کلام میں غالب و مومن کا انداز بیان اور میر کا سوز و گداز پایا جاتا ہے لیکن یہ ایک ایسا امتزاج ہے جو خود بخود پیدا ہو گیا ہے۔ فانی کی شاعری میں ایک عظمت، پائندگی اور آفاقی وسعت ملتی ہے، ان کے یہاں فلسفہ بھی ہے اور عشق و محبت کے چرچے بھی ہیں۔ وہ شاعری میں مصوری بھی کرتے ہیں اور انسانی نفسیات کا تجزیہ بھی وہ اپنی دھیمی لے میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ ان کی سادگی اور پرکاری میں ایک دلکشی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک خشک فلسفی شاعر نہیں ہیں، بلکہ ایک دل کو موہ لینے والے شاعر فلسفی ہیں۔ جذبات کی مصوری واقعات و واردات کی نزاکتوں کو ایک اچھے اور دلکش پیرایہ میں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ کبھی وہ تقابل و تضاد سے ایک ایسی لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں جو ذہن میں نہیں آسکتی کبھی وہ اشاروں اشاروں میں وہ بات بیان کر جاتے ہیں کہ سننے والا سنکر تڑپتا رہے۔ اور یہی وہ تمام خصوصیات ہیں جو فانی کو ہر دلعزیز بناتی ہیں۔

ظہیر الدین احمد خاں ایم۔ اے (علیگ)

مودودی نظریۂ امارت

(اسلام کے نقطۂ نگاہ سے)

ذیل کا مقالہ مودودی صاحب کو اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وہ اسے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" میں شایع فرمائیں اور اس پر اپنی رائے کا اظہار بھی کریں۔ جناب مودودی صاحب اسلام اور قرآن کے نام سے جو دعوت ایک عرصہ سے دے رہے ہیں اس کے متعلق مجھے برابر یہ شبہ رہا کہ دراصل یہ ایک طرح کا پردہ ہے جس کے نیچے کچھ اور ہی مقاصد چھپے ہوئے ہیں۔ تاکہ اس طرح مسلمانوں کو اسلام کے نام سے کسی اور سعی اور جد وجہد سے باز رکھا جائے اور یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اسلام کی تاریخ پڑھنے والے جانتے ہیں کہ ایسے ہی مواقع پر ماضی میں بھی اسلام اور قرآن کا واسطہ دے دے کر ایسی ہی تحریکیں پیدا کی گئی تھیں۔ اس پردہ کو ذرا اور غلیظ بنانے کے لئے سب سے پہلا قدم یہ اُٹھایا جاتا ہے کہ تحریک کا بانی امام یا امیر بنکر اس تحریک کی قیادت بھی اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ مجھے مودودی صاحب کے متعلق کچھ یقین سا تھا کہ تحریک کے بارور ہونے کے ساتھ ہی وہ یہ قدم اُٹھائیں گے اور مجھے جہاں تک یاد ہے میں نے اپنے ایک دوست سے جو میرے ہموطن ہیں اور اس وقت مودودی جماعت میں ایک ذمہ دار رکن کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا۔ اب جبکہ مودودی صاحب اپنی اسلامی جماعت کے امیر باقاعدہ منتخب کئے جا چکے ہیں میں نے سوچا کہ چونکہ ان کی دعوت دراصل خالص اسلامی دعوت ہے، اور یقیناً اسلام کی صحیح اسپرٹ سمجھنے کا حق جیسے ان کو حاصل ہے اسی طرح اور لوگ بھی اس کی تفسیر و تشریح کا حق رکھتے ہیں، اس لئے کیوں نہ اس مرحلہ پر مسئلہ امارت کی اسلامی حیثیت سے مختصر مگر مدلل بحث کی جائے۔ اور ان کو بھی دعوت دیجائے کہ اگر درحقیقت وہ اسلام اور اس کی تعلیمات سے کوئی گہری دلچسپی رکھتے ہیں تو اس سے متعلق اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کریں۔ یہ اپنے کو اسلامی تحریک کا بانی تصور فرماتے ہیں۔ اس لئے انھیں سراس خیال کو خوش آمدید کہنا چاہیے جو اسلامی ہے یا اسلامی اسپرٹ کا احیاء کرنیوالا ہے۔ اس میں جہاں اور بہت سے فایدے ہیں وہاں ایک بڑا فائدہ جو خاص طور پر میرے پیش نظر تھا یہ تھا کہ اگر واقعی وہ اپنے مخصوص مقاصد پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں تو اس طرح وہ پردہ چاک ہو جائے گا۔ مگر انھوں نے

بلطائف الحیل اس مقالے کی اشاعت سے گریز کیا۔ اور جب ان کے ایک حق پسند ارادت مند نے اس پر احتجاج کیا تو یہ کہکر پیچھا چھڑایا کہ "اس کی ساری بنائے استدلال نہایت کمزور ہے"۔ اور یہ کہ "اس میں جو نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے اگر وہ پورے دلائل کے ساتھ لکھ دیا جاتا تو اس کی تردید اس پہلو سے مفید ہوتی کہ جو لوگ اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں ان کی غلط فہمیاں دور ہو سکیں"۔

اگر اس مضمون کی "بنائے استدلال کمزور ہے" اور ساتھ ہی "اس میں پورے دلائل" کے ساتھ بحث نہیں کی گئی ہے تو غالباً اس کا جواب نہایت آسان ۔ میں کوئی بات منافی تعلیم اسلام کہنا نہیں چاہتا اور مودودی صاحب اور ان کے ہم خیال اصحاب کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ اس کمزور بنائے استدلال کو ڈھانے کی ذرا کوشش تو کریں۔ اسلامی اخلاق کی جس بلندی کا وہ ڈھنڈورا پیٹتے رہے ہیں اس کا اظہار تو اس سے ہو گیا کہ جب تک جوابی کارڈ نہ بھیجا گیا اس وقت تک یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ مضمون انھیں موصول بھی ہوا یا نہیں۔ اب ذرا اپنے مزعومہ علمی تبحر اور "دقت نظر" کا ثبوت بھی پیش کریں۔

موجودہ سیاسیات میں مسئلہ امامت کو جو اہمیت حاصل ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس مسئلہ پر خالص نقطۂ نگاہ سے بھی روشنی ڈالی جائے اور بتایا جائے کہ اسلام میں اس کی نوعیت کیا ہے ؟ اس مسئلہ کا تعلق بعض دوسرے مسائل و مباحث سے بھی ہے اور اتنا قریبی تعلق ہے کہ خاص اس مسئلہ کی پوری پوری وضاحت سے ان مسایل کے متعلق جو شبہات یا غلط فہمیاں ہیں ان کے رفع ہو جانے کا بھی قوی امکان ہے البتہ اس سلسلہ میں بہر حال یہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ مسئلہ کے تمام گوشوں کو اسلامی اور محض اسلامی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اس لئے کہ بہت ظاہر ہے کہ اسلام کی اس طویل سیزدہ صد سالہ تاریخ میں بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر کچھ ایسے تصورات، افکار، اور وجہات نظر بھی اسلام اور اس کی تعلیمات میں راہ پا گئے ہیں جو کسی طرح بھی اسلامی نہیں کہے جا سکتے۔ اس مسئلہ میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یہ مسئلہ بھی غیر اسلامی نقطہائے نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ اور اس میں بھی جاہلی یا کم سے کم عربی عناصر جو اسلام سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے دخل پا گئے ہیں۔

اسلام کے ابتدائی عہد میں حضرت اکرم کی وفات کے بعد امارت یا امامت کے باب میں اصحاب رسول نے بھی اختلاف کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اختلاف ایک واضح ثبوت ہے اس امر کا کہ مسئلہ پر اسلامی نگاہ سے غور نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو یقین ہے کہ سرے سے اختلاف ہی نہ ہوتا اور اگر ہوتا تو کم سے کم اسکی نوعیت وہ نہ ہوتی جو ہے۔ نہ اختلاف اتنی شدت اور وسعت کے ساتھ ہوتا اور نہ برابر بڑھتا اور پھیلتا ہی چلا جاتا۔

اسلام اور قرآن کے نزدیک نبوت، امامت، رسالت، حکومت، خلافت وغیرہ الفاظ قریب قریب

ہم معنے ہیں۔ امر اور حکم صرف خدا کے لئے ہے اور خدا بمقتضائے ضرورت اپنے امر و حکم کے نفاذ کے لئے مختلف اقوام، اوطان اور ازمان میں اپنے نائب اور خلفاء ارسال فرماتا رہا ہے۔ یہ امر اس قدر واضح ہے کہ میری رائے میں اس کی مزید تشریح ضروری نہیں۔ ذیل کی چند آیات کافی ہیں۔

"ان الحکم الا للہ" (حاکم حقیقی صرف خدا ہی ہے)

"قل ان الامر کلہ للہ" (فرما دیجئے کہ امر و حکم صرف خدا کے لئے ہے۔

"ماکان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب والحکمہ والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادا لی من دون اللہ۔

کسی بشر کے لئے جائز نہیں کہ اللہ اس کو کتاب حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ میری عبادت کرو۔

ان کنا مرسلین۔

ہم اپنے انبیاء بھیجتے رہے ہیں

انبیاء کے بے شمار فرائض میں سے دو اہم فرض یہ ہیں۔

(۱) تشریع — (۲) تنفیذ امر الٰہی۔

تمام انبیاء اپنے دو گانہ فرائض انجام دیتے رہے۔ یہ انجام دہی جیسا کہ عرض کیا گیا، اصالۃً نہ تھی۔ بلکہ خدا کے نائب اور قایم مقام ہونے کی حیثیت سے وہ ان فرائض کو انجام دیتے تھے۔ اسی لئے ضرورت کے وقت اور موقع کے مناسب خدا ان کی اعانت فرماتا تھا۔ دشوار اور اہم امور میں ان کی رہنمائی کی جاتی تھی۔ ان پر وحی نازل ہوتی تھی اور القاء روحی سے ان کو سرفراز کیا جاتا تھا۔ شاید اسی لئے وہ اس اہم بار کو آسانی کے ساتھ اُٹھا لیتے تھے اور کامیابی کے ساتھ اپنے دشوار ترین فرض کی انجام دہی بھی کر لیتے تھے۔ اسی لئے انکی اطاعت ضروری تھی۔ ان کے امر کے سامنے بندگان خدا کو اپنے سر جھکا دینے کا حکم تھا۔ در اصل یہ اطاعت خدا کی اطاعت تھی۔ یہ فرماں برداری امر و حکم الٰہی کی فرماں برداری تھی۔ اس لئے کہ انبیاء اور رسل براہ راست خدا سے ہدایت حاصل کرتے تھے۔ اور جو کچھ امر حقیقی کی طرف سے ان پر نازل ہوتا تھا بے کم و کاست خدا کے بندوں تک پہونچا دیتے تھے۔ ان کو حکم تھا۔

یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک فان لم تفعل فما بلغت رسالتہ۔

اے رسول جو کچھ تمھیں امر فرمایا جاتا ہے اُسے جوں کا توں ہمارے بندوں تک پہونچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ خدا کی رسالت میں قاصر رہیں گے۔

رسول کی حیثیت یہ تھی:

ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ

ہم نے جو رسول بھیجا اس غرض سے بھیجا کہ خدا کے اذن سے اسکی اطاعت کیجائے

اسلام میں امامت بھی یہی ہے۔ اس کی نوعیت اور حیثیت بھی وہی ہے جو رسول کی ہے۔ امام اور رسول دو لفظ ہیں جن میں معنی اور مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق و امتیاز نہیں۔ جو رسول ہے وہی امام بھی ہے۔ انبیاء کی بابت خدا نے فرمایا:

وجعلناہم ائمۃ یہدون بامرنا | ہم نے انبیاء کو امام بنایا جو ہمارے امر سے لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں

انبیاء اور ائمہ کا سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور اس کے بعد خدا کی طرف سے پیہم رسول اور امام مبعوث ہوتے رہے۔ تا آنکہ امامت و ہدایت ابراہیم علیہ السلام تک پہونچی جن کو مخاطب کرتے ہوئے خدا نے فرمایا: "انی جاعلک للناس اماما" (اے ابراہیم ہم نے آپ کو لوگوں کے لئے امام اور پیشوا بنایا ہے) حضرت ابراہیم نے عرض کی "ومن ذریتی" (میری اولاد بھی تو اس کی مستحق ہے کہ ان کو امامت سے سرفراز فرمایا جائے) خدا نے فرمایا بے شک لیکن "لاینال عہدی الظالمین" (میری نیابت میرا عہد ہے جو کبھی کسی ظالم کو سپرد نہ کیا جائے گا) خدا کی نیابت یا امامت اس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کی ذریت میں مقصور رہی۔ ان میں سے انبیاء اور خدا کے فرستادے مبعوث ہوتے رہے۔ "وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتاب" (ہم نے نبوت اور کتاب ذریت ابراہیم کے لئے مخصوص فرمادی) مگر یہ سلسلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر ختم ہوگیا۔ آپ خاتم الانبیاء قرار پائے۔ امامت، نبوت، رسالت، حکومت، خلافت مختصر یہ کہ تمام صفات رشد و ہدایت حضرت اکرم کی ذات پر منقطع ہوگئیں۔ اس باب میں قرآن کریم نے یہ آخری فیصلہ فرمایا:

ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔ | آپ خدا کے رسول اور سلسلۂ انبیاء کے ختم فرمانے والے ہیں۔

حضرت نے اس فیصلہ کی وضاحت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: "لانبی من بعدی" (میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا)

نبوت اور امامت کی تاریخ بس اس قدر ہے جو قرآن شریف نے بار بار مختلف اسلوب سے بیان فرمائی ہے۔ اس میں اول یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن نے رسالت اور امامت میں کوئی تعریف نہیں کی۔ اور جس سلسلۂ نبوت کے اختتام پذیر ہونے کا اس نے اعلان فرمایا وہ درحقیقت تشریع و تنفیذ دونوں کا جامع ہے۔ اس میں تنفیذ امر کو بھی اسی طرح منقطع قرار دیدیا گیا ہے جس طرح تشریع کو۔ اگر حضرت اکرم کے بعد کوئی نبی مقنن، مشرع اور صاحب کتاب مبعوث نہیں ہوسکتا تو تقاضائے عقل و خرد یہ ہے کہ آپ کے بعد آپ کا کوئی جانشین، خلیفہ، اور نائب شریعت بھی مقرر نہ کیا جائے۔ خواہ اس کی غرض صرف اس قدر ہو کہ وہ تنفیذ امر کرے۔ لوگوں کے درمیان اختلافات کا فیصلہ فرمائے — اور ان میں نظم و ضبط قایم رکھے — کم سے کم قرآن شریف نے اس نصب کی بابت کوئی حکم نہیں دیا اور نہ حضرت اکرم ہی نے یہ امر فرمایا کہ میرے بعد میرے اصحاب یا اہل بیت میں سے

میرا جانشین مقرر کر لیا جائے۔ جو اور کچھ نہیں تو عام مسلمانوں کے درمیان امن و ضبط ہی قایم رکھے اور امر کی حیثیت سے عام مسلمان اس کے عام احکام و ہدایات کی متابعت بھی کریں۔

اسلام میں مسئلہ ختم نبوت کو جو اہمیت حاصل ہے ہمارے علماء نے بہت کم اس کا احساس کیا جسکی وجہ سے عام مسلمان ان برکات و سعادات سے فیضیاب نہ ہو سکے جو اس تصور کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر اقبال[1] نے لکھا ہے کہ ختم نبوت انسان کے ذہنی ارتقاء کے لئے ضروری ہے۔ یہ دراصل بنی نوع انسان کے ذہنی اور اخلاقی آزادی کی طرف اولین قدم ہے جو اسلام اور قرآن نے اس سلسلہ میں اُٹھایا۔ کوئی قوم اسوقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اسے آزادی سے سرفراز نہ کیا جائے اور اسے نیک و بد، راست و ناراست، حق و باطل کے دوراہے پر اس طرح نہ چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنی بصیرت، اپنی نظر، اور اپنی خبر و آگاہی پر پوری طرح اعتماد رکھتے ہوئے ان میں سے کوئی ایک راہ اختیار کرے۔ خلق آدم کی غرض اصلی بھی یہی آزادی ہے اور یہی مقصد ہے اس آیت کریمہ کا۔ "وہدیناہ النجدین" (ہم نے انسان کے سامنے دونوں راہیں کھولدی ہیں) جب تک سلسلۂ نبوت جاری رہا انسان کو اپنی قوتوں اور باطنی صلاحیتوں پر تکیہ کرنے اور ان سے کام لینے کے مواقع نہ ملے اور نہ مل سکتے تھے۔ اس لئے اس غرض کے لئے حضرت اکرم پر اس سلسلہ کو مختتم اور منقطع قرار دے دیا گیا۔

جہاں تک تشریع اور وضع قوانین کا تعلق ہے یہ درست ہے اور وہ بھی اس زمانے میں جو آزادی، حریت، جمہوریت، اور ابتکار و اختراع کا زمانہ ہے۔ جس میں قومیں اپنی جدت فکر اور جودت عمل کے بل بوتے پر ترقی کی منزلیں طے کرتی چلی جا رہی ہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک یوں ہی طے کرتی چلی جائیں گی، یہ عہد، عہد آزادی ہی نہیں بلکہ عہد جمہوریت بھی ہے۔ اس میں ارتقاء اور طے منازل کے لئے جمہوریت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی خود آزادی بلکہ آزادی سے زیادہ اس عہد میں جمہوریت درکار ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ختم نبوت کی دوگانہ اہمیت ہے اور وہ اس کے دوگانہ فرائض کی وجہ سے ہے۔ تشریع کے اعتبار سے ختم نبوت آزادی اور حریت فکر کے لئے ایک پیغام ہے۔ اور تنفیذ امر کے لحاظ سے اس میں جمہوریت اور تربیت کا سامان بھی ہے۔ ختم نبوت کے معنی صرف یہی نہیں کہ انسان حالات اور مقتضیات کے اعتبار سے آزاد ہے۔ کہ وہ اپنی شخصی رائے اور اجتہاد سے کام لے اور ابدی اخلاقی اقدار ( ) کی روشنی میں اپنے لئے کوئی راہ عمل متعین کرے۔ بلکہ اس کے ساتھ ہی کوئی فرد واحد خواہ وہ اپنی ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں کے اعتبار سے

---

[1] ملاحظہ فرمایئے "خطبات اقبال" کا خطبہ نہم

کیسی ہی بلندیوں پر فائز کیوں نہ ہو۔ اس کی قسمت کا فیصلہ بھی نہیں کر سکتا ہے۔ انسان آزاد ہے اس لئے کوئی دوسرا اس پر حکومت نہیں کر سکتا اور نہ ایک انسان دوسرے کے لئے کوئی راہ یا کوئی طریق عمل ہی متعین کر سکتا ہے۔ انسان آزاد ہے اس لئے کوئی دوسرا اس پر حکومت نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے مفادات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ ان میں نظم و ضبط بھی قایم رکھا جائے۔ ایک فرد واحد اس کے لئے کافی نہیں۔ انسان دراصل خدا کے بعد اپنا حاکم آپ ہے اور ایک سوسائٹی میں نظام برقرار رکھنے والے دراصل وہی افراد ہیں جن سے اس سوسائٹی کی ترکیب عمل میں آئی ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہی اصول حکمرانی قابل قبول ہے۔ اور مسئلہ ختم نبوت جہاں آزادی رائے کی اہمیت پر زور دیتا ہے وہاں وہ حکمرانی کے اس اولین اور سادہ ترین اصول کا جامع بھی ہے اور اس پر مشتمل بھی۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت اکرم نے اپنے جانشین کا نہ خود تقرر فرمایا اور نہ اس سلسلہ میں اپنے اصحاب ہی کو کوئی امر فرمایا۔ اور غالباً ختم نبوت والی آیت کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس کے صاف اور واضح معنی یہی تھے کہ آپ کے بعد کوئی فرد واحد بھی آپ کی متعدد حیثیات میں سے کسی ایک حیثیت کا جامع و حامل نہیں۔ جمہور مسلمین اپنے معاملات خود طے فرمائیں۔ جماعتی اور انفرادی ذمہ داریوں کا صحیح احساس رکھتے ہوئے اپنے باہمی اختلافات دور کریں۔ اور ہر اہم معاملہ کو اگر اس میں اختلاف ہو تو آپس کے مشوروں سے فیصل فرمائیں۔ چنانچہ اس اصول جامع کو ذیل کے جامع الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے۔

"وامرہم شوریٰ بینہم" (مسلمانوں کے اہم معاملات آپس کے مشوروں سے طے پاتے ہیں)

ہر چند ولایت امر کسی فرد واحد کے لئے مخصوص نہیں، مگر اسلام یہ جانتا ہے کہ تمام افراد انسان ایک حیثیت اور ایک صلاحیت کے حامل بھی نہیں۔ انسان ہوتے ہوئے بھی ذہنی اعتبار سے ان میں اختلاف ہے۔ بعض ان میں سے اصابت رائے اور جودت ذہن میں دوسروں سے زیادہ ممتاز ہیں اور مقابلۃً اہم امور کو کسی قدر آسانی کے ساتھ طے کر سکتے ہیں۔ یہ اصحاب قرآن کی اصطلاح میں اولی الامر یا امراء ہیں۔ قطع خصومات و فصل قضایا ان صاحبان خرد و ہوش کے متعلق ہے۔ عام مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ اللہ اور رسول کے بعد ان اصحاب کی اطاعت کریں اور ان کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں۔

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی۔ اور ان اصحاب کی جو مالک امور ہیں۔

اس آیت میں "اولی الامر" کو جو جمع لایا گیا ہے وہ اس غرض سے ہے کہ یہ بتایا جا سکے کہ رسول کے بعد تنہا ایک شخص "ولی الامر" حاکم یا امیر نہیں ہو سکتا، اور تنفیذ امر یا قطع خصومات وغیرہ امور کے لئے مناسب یہ ہے کہ

صاحبان رائے کی ایک مجلس بنائی جائے جو آپس کے مشوروں سے اسلام اور عامتہ المسلمین کے متعلق ضروری امور کتاب اور سنت کی روشنی میں فیصل فرمائے۔ مسلمان "اولی الامر" کے ان تمام فیصلوں کو مانیں جو کتاب اور سنت کے مطابق ہوں۔ اور اگر ان کی نگاہ میں وہ اُصول شرع کے موافق نہ ہوں تو قرآن اور سنت کی طرف رجوع کریں۔

فان تنازعتم فی شیئٍ فردوہ الی اللہ والرسول۔	اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو خدا اور رسول کی طرف رجوع کیا جائے۔

دراصل "اولی الامر" کی ولایت اور نیابت براہ راست آمر حقیقی یعنی خدائے تعالیٰ سے مستفاد نہیں۔ وہ انبیاءؑ کی طرح بے واسطہ خدا سے علم اور ہدایت حاصل نہیں کرتے۔ اس لئے ان سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اختلاف کی صورت میں ہم مامور ہیں کہ علم و ہدایت کے اصل سرچشموں ہی سے یقین اور روشنی حاصل کریں۔

اور تو اور خود حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی "اولی الامر" موجود تھے اور ان کی وہی حیثیت تھی جو آپ کے بعد امراء اور اولیاء امر کی ہے۔ حضرت اکرم کے زمانہ میں بھی عام مسلمانوں کو یہی حکم تھا کہ وہ خدا اور رسول کے بعد ان کی طرف رجوع کریں اور ان کے صوابدید کے مطابق ہر اہم اور پیچیدہ امر کو طے فرمائیں صلح کا زمانہ ہو یا جنگ کا۔ امن کی حالت کی ہو یا خوف کی۔ ہر صورت اور ہر حالت میں ان "اولی الامر" کی رائے اور ان کے مشورہ ہی سے کام کیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کی ایک جماعت کو جو اس اُصول پر کاربند نہ تھی۔ اس طرح تنبیہ کی گئی:

واذا جاءہم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ، ولو ردوہ الی الرسول والیٰ اولی الامر منہم، لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم۔	جب امن یا خوف (یعنی صلح و جنگ) سے متعلق انھیں کوئی خبر ملتی ہے تو وہ اسے مشتہر کر دیتے ہیں اسکی جگہ اگر وہ رسول اور اولی الامر کے سامنے اسے رکھدیں تو ان میں سے جو استخراج اور استنباط کی اہلیت رکھتے ہیں وہ اس کی پوری حقیقت سے آگاہ ہو جائیں۔

اس آیت میں بھی "اولی الامر" کو جمع ہی لایا گیا ہے۔ یہ اولی الامر حضرت اکرم کے زمانہ میں تھے اور آپ کی موجودگی میں تھے۔ جن کی طرف اہم امور رد کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت کے بعد یہی اولی الامر باقی رہے جو مل جل کر تمام سیاسی اور انتظامی امور کے مالک اور ان کے حامل قرار پائے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی دوسرے پر یہ فوقیت حاصل نہیں کہ وہ تنہا امیر یا حاکم بنا دیا جائے اور اس حیثیت سے تمام امور و معاملات کا تنہا

مالک وہی قرار پائے۔ قرآن شریف نے اس باب میں کوئی امر نہیں فرمایا اور نہ کسی آیت سے اشارۃً یا دلالۃً اس قسم کی مستبدانہ امارت یا اس کے قیام کا جواز ہی مفہوم ہوتا ہے۔

البتہ اس سلسلہ میں دو باتیں ایسی ہیں جن سے اس مسئلہ کی اسلامی حیثیت کسی قدر دھندلی ہو جاتی ہے ایک یہ کہ حضرت اکرم نے خود و فود و جیوش کے لئے تنہا ذمہ دار اور بااختیار آمر مقرر فرمائے ہیں۔ دوسرے یہ کہ حضرت کی وفات کے بعد صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت نے جو غالباً اولی الامر کی اکثریت پر مشتمل تھی حضرت ابوبکر کو خلیفہ اور امام المسلمین چنا اور اس کے بعد برابر اسی طرح خلیفہ اور امیر کا انتخاب باہمی مشوروں سے ہوتا رہا اگر واقعی اسلامی اصول کے مطابق نبی کے بعد کوئی فرد واحد امیر یا حاکم نہیں ہو سکتا تھا تو صحابہ کی اس بڑی جماعت نے کسی ایسے امر کا ارتکاب کیوں کیا جو اسلامی روح کے منافی ہے۔ اس میں سے آخری بات کو پہلے لیجئے۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ اکابر صحابہ کی شاید ایک بڑی اکثریت نے حضرت ابوبکر کا انتخاب فرمایا۔ لیکن ان حضرات کا یہ انتخاب کسی نص شرعی کی بنیاد پر نہ تھا۔ اور نہ اس انتخاب کی ضرورت ہی کو شرعی طور پر محسوس کیا گیا تھا۔ یہ سب کچھ اجتہاد کی بنا پر کیا گیا اور اس اجتہاد کا مستند بھی صرف یہ امر عقلی تھا کہ حضرت تو اب وفات فرما چکے ہیں اگر جلد ہی آپ کا جانشین منتخب نہ کر لیا گیا تو مسلمانوں میں ضبط و نظم کیسے قایم رکھا جا سکے گا۔ اس اجتہاد پر ان حضرات کے سابقہ تصورات اور خالص عربی مدنیت بھی اثر انداز ہوئی اسلام سے پہلے عرب میں مختلف قبایل کے رئیس اور شیوخ ہوا کرتے تھے جو صاحب امر بھی تھے اور جن کے اشاروں پر شمشیریں نیاموں سے نکلتی تھیں اور سر تک قلم ہو جاتے تھے۔ ہر چند حضرات اصحاب نے بارگاہ نبوت میں تربیت پائی تھی۔ جس سے بڑی حد تک ان کی دنیا ہی بدل گئی تھی لیکن پھر بھی وہ عرب تھے۔ مدتوں عرب کی غیر اسلامی فضا میں انھوں نے سانس لیا تھا۔ اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ تمام غیر اسلامی اثرات سے اس طرح پاک ہو جائیں کہ کسی ایسے مسئلہ میں بھی جس کے متعلق ان کے پاس واضح احکام نہ ہوں، ان کے قومی جذبات اور مقامی نقوش ابھرنے نہ پائیں۔ انتخاب کے وقت انصار اور مہاجرین کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے بھی اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ یہ حضرات زیادہ تر اپنی رائے اور قیاس کے سہارے ہی امیر عام کا انتخاب فرما رہے تھے۔ جب انصار نے دیکھا کہ مہاجرین بضد ہیں کہ امیر ان میں سے ہو تو انھوں نے جھٹ یہ تجویز پیش کر دی کہ دو الگ الگ امیر منتخب کر لئے جائیں ایک مہاجرین میں سے اور دوسرا انصار میں سے۔ یہ تجویز بطور تنازل باہمی سمجھوتہ کے طور پر پیش کی گئی تھی۔ اور اسکے پیش کرنے والے بھی جاہل بدوی نہ تھے بلکہ وہ انصار تھے جو حضور کی صحبت میں کافی تربیت پا چکے تھے۔ اگر واقعی اسلامی اور شرعی نقطۂ نگاہ سے امیر کا انتخاب اتنا ہی ضروری تھا اور یہ بھی شرعی بات ہے کہ وہ ایک فرد واحد ہونا چاہئے تھا تو یقیناً اس میں کسی دو عملی کی گنجایش نہ تھی اور انصار کی طرف سے ایسے بھولے پن کے ساتھ

گو مفاہمت ہی کے طور پر سہی - اس کے پیش کئے جانے کے کوئی معنی بھی نہ تھے - دوسرے مسلمانوں میں سے ایک جماعت کا خیال ہے جیسا کہ ابن[1] خلدون نے لکھا ہے کہ امیر کی ضرورت اور حضرت کے بعد اس کا انتخاب کسی نص شرعی سے ثابت نہیں - اور اس حیثیت سے وہ کوئی اسلامی چیز نہیں - اس کی ضرورت محض امر عقلی ہے امیر کا انتخاب اس لئے کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی اور اجتماع انسانی میں نظم قایم رکھا جاسکے - ابن خلدون نے ان حضرات کی اس عقلی دلیل پر جرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا یہ عقلی استدلال جس سے وہ امارت کی ضرورت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں بہت ہی بچر اور پوچ ہے - اس لئے یقین ہے کہ نصب امام کا وجوب عقلی نہیں بلکہ شرعی ہے اور وہ ہے - صحابہ[2] کا اجماع اور ان کا اتفاق اہل ہوش جانتے ہیں کہ ابن خلدون کے اس استدلال کی حیثیت کیا ہے - مسلمانوں کے اس گروہ کا مطلب جو ضرورت امامت کو عقلی بات بتاتے ہیں - یہ ہے کہ اصحاب رسول نے جو انتخاب کیا وہ کسی شرعی اور نص قطعی پر مبنی نہ تھا - انھوں نے اپنی رائے اور قیاس سے امام کی ضرورت سمجھتے ہوئے اس کا انتخاب فرمایا - اب اگر ابن خلدون جیسے منطقی اور فلسفی اس عقلی ضرورت کا تار و پود بکھیرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ حضرات صحابہ نے ضرور ہی کسی شرعی حکم پر تکیہ کرتے ہوئے یہ انتخاب فرمایا تھا - رہا صحابہ کرام کا اجماع سو وہ شرعی نہیں - یعنی وہ کسی مستند شرعی پر مبنی نہیں جیسا کہ عرض کیا جا رہا ہے بلکہ وہ عقل و رائے سے یہ سمجھ کر ہوا کہ اس کے سوا مسلمانوں میں نظم و ضبط قائم رکھنے کی کوئی اور صورت ہی نہیں - لیکن زمانہ نے یہ بتایا کہ امارت کے لئے کسی فرد واحد کا انتخاب کوئی زیادہ بہتر چیز نہ تھی اس انتخاب سے بظاہر مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہوئی لیکن درحقیقت نفاق و افتراق کا ان میں بیج بو دیا گیا اور ابھی مشکل سے حضرت کی وفات پر تیس سال سے زیادہ نہ گزرے تھے کہ وہی مسلمان جن کی "تالیف قلوب" کا ذکر قرآن نے مسرت[3] کے ساتھ کیا ہے اور ان کے اتحاد و اتفاق کو خدا کی نعمت بتایا ہے، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے - حضرت کے الفاظ[4] میں وہ پھر کفر کی طرف لوٹ گئے اور کفار کی طرح ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگے

---

[1] وقد ذہب بعض الناس الی ان مدرک وجوبہ العقل وان الاجماع الذی وقع انما ہو اقتضاء بحکم العقل (مقدمہ ص ۱۶۰)

[2] فلا تنہض دلیلہم العقلی المبنی علیٰ ہذہ المقدمۃ فدل علی ان مدرک وجوبہ انما ہو بالنزع و ہذا الاجماع الذی قدمناہ (القیاً ص ۱۶۰)

[3] کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا -

[4] لاترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم وتاب بعض -

پھر آخر اس ناگوار تجربہ سے فایدہ اُٹھا کر اور کتاب وسنت پر مبصرانہ نگاہ رکھتے ہوئے امامت وامارت کے باب میں صحیح اسلامی روح تک پہونچنے کی کوششیں کیوں نہ کی جائیں جبکہ وہ عقلی ضرورت جس سے مجبور ہوکر افراد کو ائمہ منتخب کیا گیا تھا اس طرح بھی رفع ہوسکتی ہے کہ افراد کی جگہ رؤسا، اور اولی الامر کی ایک مجلس بنا دیجائے جو ان تمام فرائض کو انجام دے جو امراء یا ائمہ انجام دیتے ہیں۔ یہ مجلس رؤسا باحسن وجوہ ان فرایض کو انجام دے سکتی ہے اس کا اعتراف ابن خلدون جیسے ماہر اجتماعیات نے بھی کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"بل کما یکون بنصب الامام یکون بوجود الرؤساء اہل الشوکۃ"

یعنی جس طرح عوام کا باہمی نزاع ایک امام کے نصب کرنے سے رفع ہوسکتا ہے اسی طرح اس کے رفع کرنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ جماعت میں با اقتدار رؤسا کی ایک مجلس قایم کر دیجائے۔

دوسرے یہ بھی صحیح نہیں کہ منصب امام کی بابت صحابہ اور تابعین کا اجماع ہوچکا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پورے چھ ماہ تک حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ وہ یہ فرماتے تھے کہ مجھے ان حضرات سے ایک شکایت ہے اور وہ یہ کہ امر امامت میں ہمارا بھی حق تھا۔ لیکن ہم کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور مشورہ تک میں شریک نہ کیا گیا۔ ادھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت ابوبکر کا انتخاب کسی قدر عجلت میں ہوا۔ اس کے علاوہ معتزلہ، خوارج اور بعض دوسرے فرقوں اور جماعتوں کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ نصب امام کو سرے سے واجب یا ضروری ہی نہ سمجھتے تھے نہ شرعاً اور نہ عقلاً۔ چنانچہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:۔ "وقد شذ بعض الناس فقال بعدم وجوب ہذا النصب لا بالعقل ولا بالشرع منہم الاصم من المعتزلہ وبعض الخوارج وغیرہم"۔ ان حضرات کے ہوتے ہوئے اجماع کا دعویٰ کچھ مناسب نہیں۔ اور اگر بطریق تنازل اسے اجماع تسلیم بھی کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ وہ اس زمانہ کے حالات اور مقتضیات کے مطابق ہوگا اور اب جبکہ حالات بہت کچھ بدل چکے ہیں اور زمانہ کہیں سے کہیں پہونچ گیا ہے یہ اجماع ہمارے لئے کوئی حجت یا کم از کم حجت شرعی نہ ہوگا۔ جس طرح امامت کے لئے قرشیت کی شرط جو ایک مشہور حدیث سے ثابت ہے، قاضی ابوبکر باقلانی اور خود ابن خلدون کے نزدیک اس لئے ساقط ہے کہ قریش کی عصبیت ہی نہ رہی جس کی وجہ سے یہ شرط لگائی گئی تھی۔ اسی طرح زمانہ موجودہ کے حالات جو بہت کچھ مختلف ہیں اس کے مقتضی ہیں کہ سرے سے فرد واحد کی امارت ہی کو ضروری نہ سمجھا جائے۔ خصوصیات کے ساتھ اس صورت میں جبکہ وہ اسلامی روح کے موافق بھی نہیں۔ بلکہ منافی کہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا۔

حضرت نے وفود اور جیوش کے لئے جو رئیس اور قائد مقرر فرمائے اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امیر کا

تقرر کوئی شرعی بات ہے۔ اس لئے کہ اولاً رئیس الوفد اور قائد الجیش کی حیثیت وہ نہیں جو امیر جماعت کی ہے۔ جماعت کا امیر مستقل ہوتا ہے اور امیر الجیش عارضی طور پر کچھ مدت کے لئے مقرر کیا جاتا ہے جسے اگر معین مدت کے لئے مقرر نہیں کیا گیا ہے تو جب چاہیں معزول بھی کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے اس کی امارت کوئی وسیع اور جامع امارت نہیں۔ وہ اپنے زیر قیادت اصحاب کے ہر شعبۂ زندگی پر کوئی مکمل تصرف اور اقتدار بھی نہیں رکھتا۔ ان رؤسا اور قواد کا کام صرف یہ ہے کہ مخصوص حالات جنگ و صلح میں وہ وفود اور جیوش کی رہنمائی فرمائیں اپنے ذاتی تجربات اور مخصوص صلاحیتوں سے کام لیکر انھیں کامیابی کی راہ دکھائیں۔ ان حالات میں فیصلے بھی عجلت کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ اس لئے اس نوع کے امیر دراصل امیر نہیں ہوتے بلکہ ایک طرح کے مشیر ہوتے ہیں۔ جن کے مشورے ان کی ذاتی صلاح اور وسیع تجربہ کی بنا پر بہرحال ماننا ہی پڑتے ہیں۔ امارت عامہ کے سلسلہ میں اس نوع کی ناتمام اور تشنہ قیادت کو مثال کے طور پر پیش کرنا مناسب نہیں۔

بات طویل ہوتی جا رہی ہے اور ابھی ان چند احادیث و روایات پر بحث کرنا باقی ہے جو وجوب امامت اور حکومت سے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔ یہ روایات بیشتر جعلی اور من گھڑت ہیں جو پیش گوئی کے رنگ میں ان اصحاب نے گھڑیں جو کسی سیاسی جماعت سے وابستہ تھے۔ میں ان احادیث کی حقیقت پر کسی اور فرصت میں بحث کروں گا۔ اس وقت اس مسئلہ کے متعلق مشہور اسلامی حکیم، مفکر اور شاعر ڈاکٹر اقبال کا فیصلہ درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اقبال نے اپنے خطبات میں لکھا ہے:

"اہل سنت والجماعت کے فقہ کے مطابق ایک امام یا خلیفہ کا تقرر ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا خلافت ایک فرد واحد کے سپرد کی جا سکتی ہے؟ ترکوں کا اجتہاد یہ ہے کہ اسلامی روح کے مطابق خلافت یا امامت ایک مجلس یا منتخب جماعت کو بھی سپرد کی جا سکتی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستان اور مصر کے علماء نے اسوقت تک اس نقطہ پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ ترکوں کا نقطۂ نظر بالکل صحیح ہے اور اس کی اثبات کی ضرورت بھی نہیں۔ حکومت کا جمہوری نظام نہ صرف یہ کہ اسلامی روح کے مطابق ہی ہے بلکہ ان جدید قوتوں پر نظر رکھتے ہوئے جو دنیائے اسلام میں آزاد چھوڑ دی گئی ہیں یہ موجودہ عہد کی ایک اہم ضرورت بھی قرار دیا گیا ہے۔" (خطبات اقبال انگریزی ص ۱۴۵)

شوکت سبزواری

(نگار) میں مودودی صاحب کو اس وقت سے جانتا ہوں، جب وہ "صاحبزادگی" کے عالم میں بھوپال آئے تھے اور یہ اور ان کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی، دونوں میرے پاس آکر گھنٹوں بیٹھتے تھے۔ یہ اب سے

تقریباً ۲۶، ۲۷ سال پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد یہ دونوں بھائی حیدر آباد چلے گئے، ابوالخیر وہاں صیغۂ تراجم و تالیف میں ملازم ہوگئے اور ابوالاعلیٰ نے قرآنی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا جو وہاں بہت پہلے سے جاری تھی۔

یہ دونوں بھائی بہت ذہین تھے، لیکن دونوں کی ذہنیتوں میں بڑا فرق تھا، ابوالخیر میں ادبیت اور ادبیت کی لچک تھی اور ابوالاعلیٰ میں مذہبیت اور مذہبیت کا تقشف۔

حیدر آباد سے یہ پنجاب چلے گئے، جہاں ہر قسم کی تحریک بہ آسانی کامیاب ہو سکتی ہے، اور سُنا ہے کہ وہاں کوئی ادارہ انھوں نے قایم کر لیا ہے، جس کا تعلق تعلیمات قرآنی سے ہے۔ افسوس ہے کہ میں نے اسوقت تک ان کی تحریروں کا مطالعہ نہیں کیا اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ اسلام اور تعلیم اسلام کو وہ کس صورت سے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر سبزواری صاحب کے اس مقالہ سے پہلی بار معلوم ہوا کہ انھوں نے مسئلہ امارت پر زیادہ زور دیا ہے اور وہ اپنی جماعت کے امیر یا قائد منتخب کر لئے گئے ہیں۔

میں یہ مقالہ صرف اس لئے شایع کر رہا ہوں کہ اس مسئلہ پر موافق و مخالف دونوں رائیں مجھے معلوم ہو سکیں اور میں کسی صحیح نتیجہ پر پہونچ سکوں۔

نیاز

دی مغل لائن لمیٹڈ

جنگ کے زمانے میں

عدن، جدّہ، پورٹ سوڈان، مصر اور ماریشس

جانے والے ہمارے مسافر اور مال کے جہازوں کی آمد و رفت ناگزیر حالات کی وجہ سے بے قاعدہ رہی

قیامِ امن کے بعد

ہمیں امید ہے کہ حالات عنقریب پہلے کی طرح ہو جائیں گے اور ان بندرگاہوں کو سفر کرنے والوں اور مال بھیجنے والوں کے لئے انشاء اللہ بہت جلد ہمارے جہازات پھر اسی مستعدی اور باقاعدگی سے آنے جانے لگیں گے۔

دریافت طلب اُمور کے لئے:۔ ٹرنر مارلیسن اینڈ کمپنی لمیٹیڈ

۱۶۔ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

گیت

"اب بھی مان جاؤ راج"

"نہیں کشور یہ نہیں ہوسکتا - میرے گیت میرا سرمایۂ حیات ہیں - انھیں میں فروخت نہیں کرسکتا"

"دیکھو پچھتاؤ گے راج"

"کچھ بھی ہو - یہ گیت نہیں ہیں میرے سنہرے خواب ہیں جو غیر مرئی دنیا کی لطافت سے اکتسا کر الفاظ کے جسم میں رونما ہوئے ہیں انھوں نے تصورات کی غیر محدود وسعت سے تنگ آکر عروض و قافیے کی پابندیاں اختیار کرلی ہیں - میرا سب لے لو لیکن انھیں چھیننے کی کوشش نہ کرو - میری ساری دولت - سارا ....

"اچھا راج - یاد رکھنا اس بات کو"

اس نے بی - اے تک پڑھا تھا - باپ کی اچانک موت کے بعد اسے تعلیمی سلسلہ منقطع کرنا پڑا - غریب امتحان بھی تو نہ دے سکا - کالج کی زندگی میں اس نے کیسی کیسی رنگین دنیائیں بنائی تھیں - زمانے نے سبکو مٹا ڈالا - وہ عرصہ سے نوکری کے لئے در در بھٹک رہا تھا - لیکن ہر جگہ مایوسی ہوتی تھی - ان ہی رائے بہادر صاحب نے جنھوں نے کالج کے جلسہ میں اس کے گیت سنکر کہا تھا: "مسٹر راج! جی چاہتا ہے کہ آپ کا قلم چوم لوں" اسے یہ کہکر جواب دے دیا "مسٹر راج میں لٹریچر کی اتنی توہین برداشت نہیں کرسکتا کہ اتنے بڑے شاعر کو نوکر کی حیثیت سے رکھوں"۔

کتنا تکلیف دہ طنز تھا - اسی رات اس نے "مزدور" کے عنوان سے ایک نظم لکھی .... کاش اشعار سے بھوک رفع ہوسکتی"۔ ایک ایک کرکے گھر کا ہر وہ سامان جو فروخت ہوسکتا تھا ہوگیا -

---

"کھانا کھالو بھیا"

"اچھا نرملا ..... یہ تمھارا چہرہ سُرخ کیوں ہورہا ہے آج ؟"

"کچھ نہیں بھیا - ایسے ہی"

راج نے پیار سے اس کے رخسار کو تھپتھپایا - وہ چونک پڑا - "ارے! تجھے تو بخار ہے .....

اب تک مجھ سے کیوں نہ کہا ؟ ------ پگلی کہیں کی ---- چل لیٹ بستر میں۔ میں ابھی دوا لایا"

"لیکن بھیا یہ کھانا۔ ------- !!!"

اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا۔ راج بے تحاشہ باہر نکل گیا۔

"کہئے کیا پیش کروں ؟"

"میں ! ---- کچھ نہیں ---- میرا مطلب ---- میں ---- میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ...

کہ ..... میں ....."

"کہئے کہئے کیا خدمت کر سکتے ہیں ہم آپ کی ؟"

"یہ سگرٹ کیس ....."

"اس ساتھ کا اور چاہئے ؟ ہاں یہ آپ کو صرف اسی دوکان پر مل سکے گا۔ کل ہی مال آیا ہے ....

ارے بھولا ! ..... ذرا سگریٹ کیس دکھانا آپ کو"

"جی میں تو اسے فروخت کرنا چاہتا ہوں"

حقارت سے "کیا کہا ؟ بیچنا ؟ ..... ہمیں بھی کیا کوئی کباڑی سمجھ رکھا ہے ؟"

راج کو جاتا ہوا دیکھ کر "اگر آٹھ آنے کے پیسے لینا ہوں تو لے لو"

راج نے بغیر کچھ کہے سنے پیسے لے لئے"

راج ہانپتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ دودھ اور دوا لیکر

"نرملا دیکھ میں تیرے لئے کیا کیا لایا"

نرملا بخار میں بیہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے آنکھ تک نہ کھولی راج اسکے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس نے اسکی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا لیکن اتنے آہستہ سے ڈرتے ڈرتے جیسے کوئی بہت ہی نازک شے ہو اتنی نازک کہ ذرا سی ٹھیس سے اس کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ شام ہوئی پھر صبح ہو گئی۔ نرملا کا بخار بڑھتا ہی رہا۔ راج تمام رات اس کے پاس بیٹھا روتا رہا۔ اگر آنسوؤں سے وہ اچھی ہو سکتی تو وہ اس کے لئے تمام عمر رو سکتا تھا۔

اس نے جھک کر اس کی پیشانی پر پیار کیا۔ اٹھا۔ بکس کھولا اور اپنے گیت نکالے۔ بکھرے ہوئے پریشان سے کاغذوں کا ایک پلندہ ۔ یہی تھی اس کی ساری کائنات۔ عزیز ترین ملکیت۔

بہن پر سے وہ کیا نہیں قربان کر سکتا تھا ؟

"ہلو رآج ! کہو کیسے آئے ؟"

"یہ گیت ہیں کشور"

" اخاہ۔۔۔۔ آخر آ ہی گئے نہ راہِ راست پر ؟ ۔۔۔۔۔ میرے دوست ! مجھے شاعر بنے کی ضرورت ہے اور تمھیں روپئے کی۔ آخر کیوں نہ ہم ایک دوسرے کی مدد کریں ؟ ۔۔۔۔ اچھا بیٹھو۔ چائے منگواؤں ؟"

"نہیں کشور ۔۔۔۔ شکریہ ۔۔۔۔ میری بہن بیمار ہے۔ لاؤ روپئے دلواؤ"

"ارے کب سے بیمار ہے ؟ ۔۔۔۔۔ مجھے بہت افسوس ہے۔ اچھا لو"

چک بک نکال کر چک کاٹ کر دیتا ہے۔

"میرے خیال میں ۵۰۰۰ روپئے تمھیں مطمئن کرنے کے لئے کافی ہیں ۔۔۔ کیوں ۔۔۔ ؟"

"شکریہ کشور" راج نے چک لے لیا

ڈاکٹر کو ہمراہ لے کر راج داخل ہوا۔ " ڈاکٹر صاحب ایشور کے لئے میری بہن کو اچھا کر دیجئے۔ میرا سب کچھ لے لیجئے لیکن نرمل کو بچا دیجئے"

ڈاکٹر :۔ نبض دیکھنے کے بعد " صرف ایک گھنٹے کی دیر کر دی آپ نے"

کیا کہہ رہے ہو ڈاکٹر ؟ ۔۔۔۔ میری نرمل ۔۔۔۔ کیا میری نرمل چلی گئی ؟ نہیں ڈاکٹر ایسا نہ کہو۔ ۔۔۔ میں اسے نہ جانے دوں گا ۔۔۔ نرمل ! ۔۔۔ نرمل ؟ ؟ ۔۔۔ آہ ۔۔۔ چلی گئیں ۔۔۔۔ کیا موت تمھیں مجھ سے زیادہ عزیز تھی نرمل ؟ ۔۔۔۔۔ ؟" ۔۔۔ روتے ہوئے اس کے منہ پر منہ رکھ دیتا ہے۔

" لو کشور !"

"یہ کیا راج ؟ ۔۔۔۔ کم ہیں ؟ ۔۔۔۔۔ اور لے لو"

"نہیں کشور اب مجھے ضرورت نہیں"

" لیکن تمھاری بہن ؟"

"وہ اب ہر ضرورت سے بے نیاز ہو چکی ہے"

چونک کر " ارے ! یہ تو بہت برا ہوا ۔۔۔۔۔ لیکن کریا کرم کے لئے تو روپئے کی ضرورت ہوگی ہی ؟"

"اس کے لئے تم فکر نہ کرو۔ گھر میں ابھی کچھ چیزیں ہیں فروخت کئے جانے کے قابل"

کچھ دیر ٹھہر کے "لیکن وہ گیت ..... ؟"

"میں گیت واپس لینے نہیں آیا۔ انھیں تم ہی رکھو اور لو ساتھ ہی یہ روپیہ بھی"

۵ سال بیت گئے — آج شہر میں بہت بڑا جلسہ ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ ملک کے سب سے بڑے شاعر نوبل پرائز لیکر آج ہی یورپ سے لوٹے ہیں۔ جلسے کے ہزارہا تالیوں کے درمیان سرکشور کھڑے ہوئے۔ ایک گیت شروع کیا:

جیون دکھ کا گیت — بندے ..... جیون .....

کون کسی کا میت — بندے ..... جیون .....

آیا تو اس جگ میں اکیلا

چار دنوں کا تھا یہ میلا

ہار گیا تو داؤں جو کھیلا

ہوئی نہ تیری جیت

بندے ..... جیون .....

یکایک سرکشور گھبرا سے گئے شاید اگلے الفاظ بھول گئے یا نہ معلوم کیوں؟ ۔ "معاف کیجئے ذرا میرا سر چکرا رہا ہے" یہ کہکر وہ بیٹھ گئے۔ اچانک کسی سمت سے ایک بھکاری چلا آیا۔ پھٹے ہوئے کپڑے۔ بڑھے ہوئے بال، عجیب پریشاں حال... اشٹیج پر آکر انسے پڑھنا شروع کیا: نیینن میں چھایا اندھیارا ⁘ ٹوٹ گیا ہے آس کا تارا

گرتے کو دے کون سہارا ⁘ یہی جگت کی ریت

بندے ..... جیون .....

"ارے یہ کون شخص ہے سرکشور؟"... کسی نے پوچھا۔ سرکشور گھبرا گئے اور بھکاری کی طرف دیکھا۔ بھکاری شرمندہ سا ہوکر چلا گیا۔ سرکشور اپنے آپ کو سنبھال کر بولے — "یہ شخص؟ .... ؟ ولایت جانے سے قبل۔ میرا خاص نوکر تھا چونکہ ہر وقت میرے ہمراہ رہتا تھا اس لئے میرا اکثر کلام اسکو یاد ہے"۔ جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

دوسرے روز سرکشور، کلکٹر صاحب کے ہاں چائے پی رہے تھے۔ کلکٹر صاحب ان پر بہت مہربان تھے۔۔ اور کیوں نہ ہوں۔ ان سے بہتر داماد انھیں اور کون مل سکتا تھا؟... انکی لڑکی بھی بیٹھی تھیں۔ ہاتھ میں اخبار تھا۔ ایک خبر پر وہ چونک پڑیں "ارے" "کیا کوئی خاص بات ہے بیٹی؟... ذرا پڑھو تو" کلکٹر صاحب نے فرمایا

"کل ۲۱ اکتوبر۔ ملک کے نامور شاعر سرکشور کے ایک دیرینہ ملازم نے ریل کے نیچے آکر خودکشی کرلی۔ پوسٹ مارٹم والوں کی رپورٹ ہے کہ اس کا دماغ خراب ہو چکا تھا"

سرکشور کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ پڑی۔

پریمی (علیگ)

ایک شعبدہ گر سائنس داں

دنیا کے بڑے بڑے سائنسدانوں میں غالباً پروفیسر منٹگومری لو، ہی تنہا ایسے عالم ہیں جنھوں نے عام انسانی زندگی کو پر لطف اور آرام دہ بنانے کے لئے سب سے زیادہ ایجادیں کیں۔

پروفیسر لو کو اس طرح کی چھوٹی چھوٹی اختراعات و ایجادات کا بہت شوق ہے جو ہماری روز کی زندگی میں زیادہ کار آمد ثابت ہوں۔ مگر پروفیسر کی شہرت کا انحصار زیادہ تر ان ایجادوں پر ہے جو لاسلکی اور انجنوں سے تعلق رکھتی ہیں۔

پروفیسر لو، کی بعض چھوٹی چھوٹی ایجادیں بہت دلچسپ ہیں۔ ایک بار انھوں نے ایک ایسا سگرٹ ایجاد کیا جو موٹر چلاتے وقت بھی پیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے یہ دیکھ کر کہ معمولی سگرٹ کی راکھ موٹر چلاتے وقت ہوا کے جھونکے سے آنکھوں میں چلی جاتی ہے۔ انھوں نے ایک عرق طیار کیا جو تمباکو میں ملا دیا جاتا ہے اور جس سے سگریٹ کی راکھ ہوا کے تیز جھونکوں سے بھی منتشر نہیں ہوتی۔ سگرٹ جلتا جاتا ہے مگر راکھ اپنی جگہ پر قایم رہتی ہے اور لطف یہ ہے کہ تمباکو کے ذائقہ پر اس عرق کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

انھوں نے اپنے کتوں کے بلانے کے لئے ایک خاص سیٹی ایجاد کی تھی۔ آدمی اس کی آواز قطعی نہیں سن سکتا تھا لیکن کتا سن لیتا تھا۔

ان کی ایک اور دلچسپ ایجاد یہ تھی کہ موٹر خانے کے دروازے صرف ہارن کی آواز سن کر خود بخود کھل جاتے تھے۔ دروازوں کے اس پُر اسرار طور پر کھلنے کی وجہ یہ تھی کہ دروازوں میں ایک چھوٹا سا آلہ نصب تھا جس میں وائلن کا ایک باریک تار لگا ہوا تھا۔ جب موٹر کا ہارن ایک خاص طریقہ سے بجایا جاتا تو اس تار میں لرزش پیدا ہوتی اور اس لرزش سے متاثر ہو کر بجلی کے ایک بٹن پر دباؤ پڑتا اور دروازے کھل جاتے اور موٹر خانے میں داخل ہوتے وقت موٹر سے اتر کر دروازہ کھولنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

انھوں نے اپنے گھر میں ایسے دروازے لگائے تھے جو صرف روشنی پڑنے سے کھل جاتے تھے اور اسکی ترکیب یہ تھی کہ ہر دروازہ میں سلینیم (Selenium) سے بھری ہوئی ایک نلکی لگا دی تھی اور سلینیم کا قاعدہ ہے کہ جب اس پر روشنی پڑتی ہے تو وہ برقی رو میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

انھوں نے ہی سب سے پہلے آواز کے فوٹو لینے کا آلہ ایجاد کیا۔ یہ آلہ سماعت پیما (audio meter) کہلاتا ہے۔ اس آلہ میں ایک بہت ہی پتلا اور حساس کی دھات کا پردہ ہوتا ہے اور اس سے ملا ہوا ایک چھوٹا سا آئینہ جس سے روشنی کی ایک باریک شعاع نکلتی ہے اور اس کے مقابل فوٹو لینے والے کاغذ پر پڑتی ہے۔ جب مشین کھول دی جاتی ہے تو کاغذ آگے کی طرف کھسکنے لگتا ہے۔ اگر اُس وقت بالکل خاموشی ہوتی ہے تو روشنی کی شعاع بالکل حرکت نہیں کرتی۔ اور فوٹو کے کاغذ پر صرف ایک سیدھی لکیر بن جاتی ہے۔ لیکن اگر اُس وقت کوئی آواز ہوتی ہے تو کاغذ کی حرکت کے ساتھ ساتھ وہ شعاع بھی حرکت کرنے لگتی ہے اور آواز کے اُتار چڑھاؤ کے نشان اُس کاغذ پر بن جاتے ہیں۔

لندن کی زمین دوز ریلوے میں پہلے اس قدر شور پیدا ہوتا تھا کہ مسافر ایک دوسرے کی آواز نہیں سُن سکتے تھے۔ پروفیسر آو نے اپنے اسی آلہ کے ذریعہ سے اُن پُرزوں کا پتہ چلایا جو حرکت کے وقت شور پیدا کرتے تھے۔ چنانچہ پرزوں کے اس نقص کو دور کر دیا گیا اور اب لندن کی زمین دوز ریلوے میں بیٹھ کر آدمی جیب گھڑی کی آواز بھی سُن سکتا ہے۔

پروفیسر آو نے گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں لاسلکی کے ذریعہ سے اُڑنے والے ہوائی جہازوں کے بارے میں بھی تجربات کئے تھے۔ اس سے قبل یہ خود اور دوسرے ماہرین سائنس بھی اس قسم کے طیارے ایجاد کرنے کی فکر میں تھے مگر کامیابی نہ ہوئی تھی۔ لیکن پروفیسر آو اپنی دھن کے پکے تھے اور آخر کار انھوں نے ایسا طیارہ ایجاد کیا جیسا وہ چاہتے تھے۔

جب ان کا بنایا ہوا ہوائی جہاز میدان میں لیجا کر کھڑا کر دیا گیا اور پروفیسر آو، کنٹرول کرنے والی مشین کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی پروفیسر آو نے کنٹرول کی وائرلس مشین کا ایک بٹن دبایا۔ طیارہ نے حرکت کرنا شروع کی، پھر وہ تیزی سے دوڑنے لگا اور چند لمحوں کے بعد وہ ہوا میں معلق ہو گیا، مگر وہ طیارہ تھوڑا ہی سا اونچا ہوا تھا کہ دفعتاً نیچے گر کر تباہ ہو گیا۔ اگرچہ پروفیسر آو کا یہ تجربہ ناکام رہا مگر اُس تجربہ سے بلا طیارچی کے اُڑنے والے طیاروں کی ایجاد کی امیدیں قوی تر ہو گئیں۔

پروفیسر آو نے گزشتہ جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد بھی ہوائی حملے اور ہوائی مدافعت کے بارے میں اپنے تجربات جاری رکھے، کیونکہ آپ کو فضائی جنگ کی اہمیت کا کافی اندازہ تھا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آپ نے لکھا تھا کہ آیندہ جنگ میں فضائی حملوں کو روکنے کے لئے زہریلی گیسوں کے استعمال کا بہت خطرہ ہے۔ یہ زہریلی گیسیں زمین سے کئی ہزار فٹ اونچی بلندی پر بادل کی طرح چھا جائیں گی۔ ان بادلوں کے نیچے رہنے والوں کو تو اُس گیس سے کوئی خطرہ نہ ہوگا مگر جو طیارچی اُن بادلوں سے ہو کر گزرے گا فوراً مر جائے گا۔ اس کے

اس کے علاوہ فضا میں وائرلس کی گرم لہریں بھی بھیجی جائیں گی۔ یہ لہریں فضا میں پہونچکر اتنی گرم ہو جائیں گی کہ طیاروں کو تباہ کر سکیں۔

اسی قسم کے اور امکانات کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے آخر میں لکھا ہے کہ — حال ہی میں ڈنمارک کے ایک سائنسداں نے حکومت ڈنمارک کے سامنے سائنٹفک مدافعت کی ایک اسکیم پیش کی ہے۔ اس اسکیم کی رو سے فوج میں سپاہیوں کی ضرورت باقی نہ رہ جائے گی بلکہ صرف چند سائنسداں پورے ملک کی حفاظت کر سکیں گے تمام سرحدی مقامات پر کیمیاوی اور برقی لہریں پیدا کرنے والی اور زہریلی گیس پیدا کرنے والی مشینیں لگا دی جائیں گی۔ اور دشمن کی فوج جیسے ہی ملک کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے گی یہ مشینیں اسکو تباہ کر دیں گی اس طرح ملک کے لاکھوں نوجوانوں کی جانیں محفوظ رہیں گی جو ہر مرتبہ جنگ میں کام آتے ہیں۔

پروفیسر لو کا خیال ہے کہ کچھ دنوں بعد کارخانوں میں مزدوروں کی حاجت نہ رہ جائے گی۔ بلکہ کارخانوں سے دور بیٹھ کر وائرلس کے ذریعہ بڑے بڑے کارخانوں کی مشینوں کو چلایا جا سکے گا۔

پروفیسر لو آجکل غذا کی کمیابی کے مسئلہ کو حل کرنے میں مصروف ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ اگر دنیا کے اُن خطوں کو گرم کیا جا سکے جہاں سال کے زیادہ حصے میں برفباری ہوتی رہتی ہے یا جہاں ٹھنڈک کی شدت کی وجہ سے غلہ پیدا نہیں ہو سکتا، تو دنیا میں غذا کی کمی کے مسئلہ کو بہت آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے اور قطبین اور اس کے قریب کے خطوں کو اسی طرح گرم کرنے کے بعد لاکھوں مربع میل زمین کاشت کے لئے حاصل کی جا سکتی ہے۔ پروفیسر لو کا خیال ہے کہ لاسلکی بجلی کی گرم لہریں اس کام کو انجام دے سکتی ہیں۔ چنانچہ آپ نے اس بارے میں مختلف تجربات کئے ہیں۔ اور آپ دو فٹ دور لوہے کی کیل کو ان لہروں سے گلانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

ضرورت !

ہم مختلف کمپنیوں، فرموں، اور فلم ساز اداروں میں اہل تجربہ کار یا تجربہ حاصل کرنے کے خواہشمند اصحاب کے لئے عارضی یا مستقل روزگار کا بندوبست کر سکتے ہیں، اگر آپ کو موقعہ مل گیا تو آپ اوسطاً ۳ روپئے سے لیکر ۱۵ روپئے تک روزانہ کما سکتے ہیں — ۴ر کے ٹکٹ بھیجکر پراسپکٹس طلب کیجئے۔

سوشل سروس انفارمیشن لیگ

پوسٹ بکس نمبر ۳۶۰۶ - بمبئی ۴

باب لاستفسار

فراق کے بعض اشعار

(جناب اس۔ام۔ اصطفیٰ فارسٹ رینج سوہلوا)

مخدومی - فراق گورکھپوری کے چند اشعار اور ان کے تخیل شاعری کو ذیل میں درج کرنے کے بعد چند سوالات پیش کر رہا ہوں - امیدوار ہوں کہ اپنی پہلی فرصت میں اپنے نگار میں روشنی ڈالئے گا۔

یہ بھیگی مسیں روپ کی جگمگاہٹ — یہ مہکی ہوئی رسمی مسکراہٹ
تجھے بھینچتے وقت نازک بدن پر — وہ کچھ جامۂ نرم کی سرسراہٹ
پسِ خواب پہلوئے عاشق سے اُٹھنا — ڈھلے سادہ جوڑے کی وہ ملگجاہٹ

یہ تینوں شعر فراق کی نظم "محبوبِ شامِ عیادت" کے ہیں۔ پہلا شعر نظم کا مطلع ہے۔ اب موصوف کی کتاب روح کائنات کے دیباچہ کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:۔

"شاعری عشقیہ ہو یا غیر عشقیہ، غزل ہو یا نظم، اس کی حقیقی روح کئی عناصر کے باہمی حلول سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے اصلی خد و خال میں انھیں عناصر کا آب و رنگ جھلکتا ہے۔ بچپن کی معصومی اور نرمی، حیات و کائنات کی سدا بہار دوشیزگی، فلسفی کے تفکر کا عمق اور وزن، تجربات میں حیرت و استعجاب، وجود کی مانوسیت، رمزیت اور طہارت کا احساس ..... یہ ہیں حقیقی شاعری کے عناصر ترکیبی ....."

دوسری جگہ حقیقی شاعری کی صفت بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ:

"ایک اور دھوکے کا شکار کچھ لوگ ہو جاتے ہیں، وہ یہ کہ چلاتے ہوئے جذبات کو کامیابی کے ساتھ نکھری ہوئی زبان کے سانچے میں ڈھال دینا حقیقی شاعری ہے۔ شاعری کے اس نظریہ سے مجھے ہمیشہ اختلاف رہا ہے"۔

جناب فراق کے اس بیان کو سامنے رکھ کر میں انکے مندرجۂ بالا اشعار کی بابت دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ (۱) کیا موصوف کے نظریہ میں اور انکے اشعار زیر نظر میں اختلاف نہیں ہے؟۔ (۲) کیا "احساس طہارت" اسی چیز کا نام ہے جسکا اظہار موصوف اپنے اشعار میں فرماتے ہیں؟۔ (۳) جس جذبہ کا اظہار ان اشعار کے ذریعہ کیا گیا ہے سب جانتے ہیں کہ وہ نیا نہیں ہے اور فارسی شاعری میں اسکی مثالیں بکثرت موجود ہیں مگر کیا ایسے اشعار کا منظر عام پر لانا ہمارے لئے کہ اس جذبہ کا پرچار قوم کے نوجوانوں میں کرنا قوم، ملک، سوسائٹی کے لئے مفید ہے؟۔ (۴) کیا شاعر کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے قبیح سے قبیح جذبات اور خیالات کو شیریں سے شیریں حکایات کی طرح جتنا چاہے اجاگر کرے اور جس طرح چاہے گیت گائے؟۔ (۵) کیا اسی ورڈ ورتھی کو ہم لیرکل شاعری یا ادب برائے ادب کہتے ہیں؟

(نگار) آپ کے استفسار کا جواب مسودہ کی صورت میں پہلے فراق کو دیا جا چکا ہے اور اسلئے میں آپ کا پیام و اعتراض یا ایڈیٹر نگار کے ذریعہ سے ان تک پہنچا دیتا ہوں مجھے امید ہے کہ وہ مختصر و بامعنی طرز تحریر اختیار کرینگے اور آئندہ اشاعت میں اس کا جواب معہ اپنی رائے کے شائع کر سکونگا۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک انھوں نے سکوت اختیار کیا ہوا ہے اور نہ معلوم کہ یہ سکوت کس انجام پر ختم ہوگا۔

بابُ الانتقاد

حیات شبلی میں مسخ حقیقت

اس زمانہ میں نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی اور علامہ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی اپنے علم و فضل کے اعتبار سے مشاہیر علما و فضلا کی صف اول میں بھی امتیاز رکھتے ہیں، اور تحقیق و تنقید میں تو مسلم الثبوت مشاہیر ہیں، لیکن جب ہم حیات شبلی پر نظر ڈالتے ہیں جو ان دونوں اصحاب کی تحقیق و تنقید کا آئینہ ہے تو قدم قدم پر اخفاء مسخ حقیقت، قیاسات دور از کار اور تدلیس کی تصویریں دیکھتے ہیں، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

(۱)

۹۶-۱۸۹۵ء میں جب آرمینا کا مسئلہ اُٹھا اور اس سلسلہ میں یورپ کا ایک ایک اخبار طرح طرح کی دروغ بافی کر کے دُنیا کی نگاہ میں ترکوں کو ملزم ٹھہرا رہا تھا اور ہندوستان کے اخباروں میں اسکی نقلیں چھپ رہی تھیں، تو مولانا سے ضبط نہ ہو سکا انھوں نے ۲۱ فروری ۱۸۹۶ء کے آزاد اخبار لکھنؤ میں ایک زبردست مضمون لکھا اور حقیقت کا پردہ چاک کیا، یہ وہ وقت تھا کہ جب وہ علی گڑھ کالج کی ملازمت میں تھے (صفحہ ۵۸)

اب اس مضمون کی حقیقت خود مولانا کی زبان سے سنئے وہ اس کی تمہید میں صرف انگریزی اخبارات کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں اور بیروت کے عربی اخبار ثمرات الفنون کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:۔ "فرانس و جرمن وغیرہ کے اخبارات اس مسئلہ میں انگریزوں کے خلاف ہیں"۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ "اخبار مذکور نے فرانس کے نہایت مشہور اخبار ایہی ژہ ورنال کے ایک آرٹکل کا ترجمہ چھاپا ہے چنانچہ اس موقع پر ہم اس کا خلاصہ نقل کرتے ہیں، مقالات جلد ہشتم یہ خلاصہ مع تمہید چار صفحات یا (۴۰) سطور کا ہے۔

اب ناظرین خود ہی فیصلہ کریں نہ یورپ کا ایک ایک اخبار رہا اور نہ مولانا کا زبردست مضمون اور نہ خلاصہ کے باعث پورا پردہ ہی چاک ہوا۔

اس کتاب کا یہ امتیازی پہلو ہے کہ مصنف، علیگڑھ اور سرسید کی تنقیص کا کوئی موقع نہیں جانے دیتے بلکہ کھینچ تان کر بے موقع بھی حملہ کر ہی دیتے ہیں چنانچہ اس بیان میں بھی اسی پر تان ٹوٹی ہے حالانکہ واقعہ یہ

کہ خود علی گڑھ کالج کے آرگن علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں ایسے متعدد مضامین انگریزی مع ترجمہ شایع ہوئے ہیں جو خود انگریزوں نے ترکوں کی جانبداری میں لکھے تھے اور نہایت زور دار تھے اس کے علاوہ اس زمانہ کے اکثر اخبارات میں اس قسم کے مضامین شایع ہوتے رہتے تھے اور ضبط نہ کر سکنے میں مولانا منفرد نہ تھے۔

المامون ہر اہل علم کی نگاہوں میں اعتبار کے قابل ٹھیری اس پر اخبارات میں بہت سے ریویو نکلے ان میں سے قابل ذکر ریویو اس زمانہ کے ایک خوش مذاق نوجوان رئیس عالم کے قلم سے نکلا تھا جس کو ملک اب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کے نام سے جانتا ہے، مولانا نے صرف اسی ریویو کا جواب ۲۱ فروری ۱۸۸۹ء کے آزاد لکھنؤ میں اس کے اڈیٹر کے پے در پے اصرار پر دیا تھا، مگر کیا عجیب یہ اختلاف تھا جس نے دونوں کو اتفاق کے ایسے مضبوط رشتہ میں جکڑ دیا جو ایک کے مرنے کے بعد بھی نہیں ٹوٹا، مولانا شروانی لکھتے ہیں کہ علامہ مرحوم سے میری سب سے اول ملاقات اندازاً ۱۸۸۶ء میں ہوئی، آغاز تعارف اختلاف سے ہوا، کتاب المامون جب شایع ہوئی تو میں نے ریویو لکھا، بعض اہم مسایل پر اعتراض تھا، غالباً یہی ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے جواب لکھا۔ یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب میں مذکور تھا:۔

رسی انگہ بدر دمن چو من　　خامہ گیری و حرف بنگاری

(صفحہ ۱۷۳ حیات شبلی)

مولانا شروانی، نواب ممدوح نے جب یہ سطریں لکھی تھیں (حیات شبلی پر نظر تحقیق کر کے مہر تصدیق ثبت کرتے وقت ان کی عمر ۷۵ سال سے متجاوز تھی جب کہ عموماً حافظہ جواب دے جاتا ہے پھر لفظ "غالباً" کی پناہ گاہ بھی انھوں نے بنالی ہے لیکن مصنف حیات شبلی کے پیش نظر تو وہ جوابی ریویو بھی تھا اور کچھ مدت پہلے ہی مقالات شبلی جلد ہشتم میں شائع کر چکے تھے۔

مولانا کا جواب ہرگز صرف اسی ریویو کا جواب نہ تھا اور ان کے مخاطب صرف اڈیٹر آزاد تھے، یہ ریویو بطور ایک خط کے ہے اور تمہید میں لکھتے ہیں کہ نہ مجھ کو فرصت اور نہ اس قدر عام رائیں لحاظ کی مستحق ہیں آجکل جس کے ہاتھ میں قلم ہے وہ نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ میں کس کس کی طرف توجہ کروں گا۔ آپ کو بہت بڑا شبہ یہ پیدا ہوا ہے کہ دولت عباسیہ میں رشید انتخاب کے قابل تھا نہ مامون، ریویو لکھنے والوں نے بھی اس بات کو زیادہ طول دیا ہے۔ اس امر اور تمام دوسرے اعتراضات کا تصفیہ وہ شخص کر سکتا ہے جس نے نہایت وسعت کے ساتھ تاریخی معلومات فراہم کئے ہیں اور ساتھ ہی باریک بیں اور تاریخی اصول کا نکتہ شناس بھی ہو"

اس تمہید کے بعد مولانا نے دونوں کا موازنہ و مقابلہ کر کے مامون کو رشید پر ترجیح دی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:۔ "کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی اوقات کو ان فضول باتوں میں صرف کروں، آپ یقین نہ کریں

کہ مجھ کو کبھی عام لوگوں کی تحسین سے نہ خوشی ہوئی اور نہ ان کے اعتراض سے رنج، میں چاہتا ہوں کہ لوگ اعتراض کریں آپ کا جی چاہے تو ان کے جواب کی طرف متوجہ ہوں مجھ کو چھوڑ دیجئے کہ "رائل ہیروز" کے باقی حصے پورے کروں

رسی انگہ بدر دمن کہ چو من خامہ گیری و حرف بنگاری

مزید تعجب تو یہ ہے کہ علامہ سلیمان۔ نے مقالات کے دیباچہ میں بھی انھیں صدر یار جنگ کے ریویو کا جواب بتایا ہے جس کا شائبہ بھی نہیں۔

(۲)

مولانا شبلی کو ۱۸۹۴ء میں شمس العلماء کا خطاب ملا تھا اس خوشی میں ایم۔ اے۔ او کالج کی دو علمی سوسائٹیوں نے تبریک و تہنیت کا مشترکہ جلسہ منعقد کیا۔ سر سید، سید محمود، محسن الملک مولانا حالی اور اساتذہ و طلبا بھی شریک تھے۔

جلسہ میں اراکین کالج اور طلباء کی تقریریں ہوئیں طلباء نے عربی فارسی اُردو نظمیں پڑھیں۔ مولانا حالی نے اس موقع پر ایک قصیدہ عربی میں پیش کیا۔ اور آخر میں مولانا شبلی نے ایک تقریر شکریہ کی۔

یہ تمام روئداد ۲۳۷ تا ۲۵۸ یعنی ۲۲ صفحوں میں درج ہے۔ متعدد نظمیں اور تقریریں مکمل طور پر منقول ہیں لیکن کس قدر حیرت ہے کہ مولانا شبلی کی تقریر کا وہ حصہ جو ان کی علمی زندگی اور علمی شہرت سے نہایت گہرا تعلق رکھتا ہے اور کچھ طویل بھی نہیں حذف کر دیا گیا جس کو یہاں بجنسہ درج کیا جاتا ہے:

"حضرات! میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اگر وہ کوئی پرسنل اور ذاتی معاملہ ہے تو آپ مہربانی سے ذاتی معاملہ کی نسبت بھی مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں اس کو اس عام مجمع میں علانیہ ظاہر کروں یعنی کالج کے احسانات جو خاص مجھ پر ہیں۔

حضرات یہ سچ ہے اور بالکل سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پا سکتا ہے تو اُس کا آغاز اس کی نشو و نما اس کی ترقی اس کی نمود اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اس کالج سے ہوا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں آنے سے پہلے میں نے تصنیف کے دائرہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور شایع ہو چکی تھیں لیکن ان کا کیا مقصد تھا آپ کے مذہبی جھگڑے مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا اس کو قوت و استحکام دینا میں آج سے بہت پہلے فارسی میں شعر بھی کہتا تھا لیکن وہ کس قسم کے اور کس درجہ کے تھے آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی موجودہ شاعری کو اعلیٰ رتبہ کی خیال کرتا ہوں بلکہ یہ مطلب ہے کہ آج کی میری شاعری اگر پست ہے تو اس وقت پست تر تھی۔ غرض یہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسی کالج کی بدولت

ہے اس لحاظ سے ہیں جس طرح اس کالج کا پروفیسر ہوں اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں

اے ممبران اخوان الصفا و نخبتہ الادب! آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ یہ کالج صرف طالبعلموں اور اسٹوڈنٹیس کو علمی ترقی دلاتا ہے۔ بلکہ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کی علمی اور روحانی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے اگر وہ طالبعلموں کو بی۔اے اور ایم۔اے کی ڈگریاں دیتا ہے تو وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کو شمس العلماء کر سکتا ہے ——— حاضرین! یہ محض ظاہر بینی بلکہ غلط فہمی ہے کہ آپ اس کالج کے فوائد کو یونیورسٹی کے کورس تک محدود سمجھیں علاوہ ان بہت سے فوائد کے جو یہاں کی مختلف سوسائٹیوں مثلاً یونین کلب الفرض اخوان الصفا نخبتہ الادب وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں اور جو اسی کالج کے ساتھ مخصوص ہیں ایک خاص بات اور سب سے بڑی بات جو اس کالج میں پائی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ یہاں ایسے اہل کمال جمع ہیں جن کی بدولت یہ کالج بہت سے ایسے مضامین کا درس گاہ کہا جا سکتا ہے جس کا نام و نشان بھی دوسرے کالجوں میں نہیں مل سکتا۔ ہمارے کالج کے احاطہ میں سید محمود، مولانا حالی، نواب محسن الملک جمع ہیں اور اس بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کالج میں فن قانون کا ایسا پروفیسر موجود ہے جس کی نظیر سے تمام ہندوستان کے قانونی کالج خالی ہیں ہمارے کالج میں شاعری اور فن شعر کا وہ پروفیسر ہے جو شاعری کا ریفارمر اور خاتم الشعراء ہے۔ ہمارے کالج میں پالیٹکس اور انتظام کا وہ بڑا پروفیسر ہے جس نے حیدرآباد کی عظیم الشان ریاست کو انگریزی طرز انتظام کے قالب میں ڈھالا ہے کیا کسی کالج کسی یونیورسٹی میں قانون، شاعری، پالیٹکس کے ایسے بے نظیر پروفیسر کوئی شخص دکھا سکتا ہے۔

حضرات! میں نے بزرگوں کی جو فہرست پیش کی ہے اس میں ایک نام اور سب سے بڑا نام دانستہ بھولا ہوں، کیونکہ میرے نزدیک جب اس کالج کا یا کالج کے متعلق جس چیز یا جس شخص کا نام لیا جائے اس میں اسی بزرگ شخص کا جلوہ موجود ہے۔ ع جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے (علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۶ فروری ۱۸۹۴ء)

محمد امین زبیری

ملک خطا کے شاہزادے

سید وصی احمد بلگرامی فانی بی۔ اے کا یہ وہ معرکۃ الآرا مقالہ ہے کہ جس وقت یہ ۱۹۲۳ء میں نگار میں شایع ہوا تو ملک میں ہلچل مچگئی اور نہ صرف ادب و انشا بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اسکا زبردست خیر مقدم کیا گیا، اس مقالہ پر اڈیٹر نگار نے تبصرہ بھی شایع کیا تھا۔ اب یہ مقالہ معہ تبصرہ کے کتابی صورت میں شایع ہوا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ۱۲ر۔ منیجر نگار

اہلِ چین کی چاءِ نوشی

اہلِ چین کے تمام مشاغل تفریح میں چار نوشی کو بڑی اہمیت حاصل ہے، یہاں تک کہ اس نے ایک فنِ لطیف کی سی حیثیت اختیار کرلی ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے بڑے سلیقہ و اہتمام کی ضرورت ہوتی ہے۔

چین کے ہر حصہ میں چار بنانے اور پینے کے قاعدے الگ الگ ہیں لیکن اس کی اہمیت ہر جگہ ایک سی ہے۔ یہاں تک کہ اس فن کے متعلق وہاں ایک قدیم کتاب "چاچنگ" بھی پائی جاتی ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم چین میں اس مشغلہ نے اب سے کہیں زیادہ زبردست فنی حیثیت اختیار کرلی تھی۔

یوں تو چین کے ہر حصہ میں چار نوشی کی فنی حیثیت مسلم ہے لیکن فوکین میں اس کی تکمیل و نمایش کی کوئی حد نہیں، جہاں کے "چاء خانے" بھی اپنی تعمیر کے لحاظ سے خصوصیت خاصہ رکھتے ہیں۔

چین، منگولیا اور تبت ہر جگہ مہمان نوازی کا اہم ترین اُصول یہی ہے کہ مہمان کے آتے ہی سب سے پہلے اس کے سامنے چاء پیش کی جائے اور یہ رسم صرف گھروں تک محدود نہیں ہے بلکہ سرکاری دفاتر، کارخانوں اور عام دوکانوں میں بھی یہی رسم جاری ہے۔ اگر میزبان اتنا غریب ہے کہ وہ چاء کا بنڈل خرید نہیں سکتا تو وہ گرم پانی کا پیالہ ہی چاء کہکر سامنے پیش کردے گا۔

چین کے جنوب مشرق میں کوئی شہر ایسا نہیں جہاں سیکڑوں چاء خانے نہ پائے جائیں، ان کی تعمیر بھی دوسرے مقامات کے چاء خانوں سے مختلف ہوتی ہے۔ یونتو یہ شب و روز کھلے رہتے ہیں، لیکن بہت تڑکے اور دوپہر کے وقت ان میں بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ یہ چاء خانے کئی کئی منزل کے ہوتے ہیں اور جو شخص جتنا مقدر ہوتا ہے، اتنی ہی اونچی منزل میں بیٹھ کر چاء پیتا ہے اور اتنی ہی قیمت زیادہ ادا کرتا ہے (گو چاء ہر منزل میں ایک ہی ہوتی ہے) سب سے اوپر کی منزل میں سب سے زیادہ قیمت ادا کرنا پڑتی ہے کیوں کہ یہاں تفریح کے لئے آرکسٹرا بھی ہوتا ہے۔

ہر شخص چاء خانے میں داخل ہوکر ایک چھوٹی سی میز کا انتخاب کرکے بیٹھ جاتا ہے اور خادم فوراً آکر پوچھتا ہے کہ کس قسم کی چاء چاہئے (عموماً یہاں آٹھ قسم کی چاء ہوتی ہے) اس کے بعد ایک بڑا ڈھکنے دار

پیالہ سے پرچ کے لایا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ایک چھوٹی سی پیالی۔ (بڑے پیالہ میں خشک پتی چار کی ہوتی ہے۔) اس کے بعد دوسرا خادم کیتلی لیکر آتا ہے اور گرم پانی چار کی پتی پر ڈال دیتا ہے۔ جب رنگ آجاتا ہے تو پینے والا پیالے کو اُٹھاتا ہے اور اس سے چھوٹی پیالی میں چار اُنڈیلتا ہے، لیکن یہ کام آسان نہیں ہے، کیونکہ پیالہ میں گرفت کے لئے دستہ نہیں ہوتا اور وہ اتنا گرم ہوتا ہے کہ اس کو چھونا آسان نہیں، اسی کے ساتھ چار انڈیلتے وقت اس بات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ دوسرے ہاتھ سے ڈھکنے کو اس پر اس طرح سادھا جائے کہ چار کا پانی تو پیالی میں آجائے لیکن پتیاں نہ آنے پائیں۔ اگر گرم پانی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے تو پیالہ کے ڈھکنے کو علٰحدہ کر دیا جاتا ہے اور کیتلی بردار بغیر کہے اس میں اور پانی ڈال دیتا ہے۔

چار خانوں میں تنہا کوئی نہیں جاتا، کیونکہ چار کے ساتھ باتیں کرنے کو بھی جی چاہتا ہے اور اس کے لئے کسی دوست کا ساتھ ہونا ضروری ہے، جس کے لئے میزبان چار اُنڈیلتا ہے اور مہمان اس خلوص و محبت کے اعتراف میں اپنی ایک اُنگلی میز پر ٹیڑھی کر دیتا ہے۔ گویا اس طرح وہ جھک کر سلام کر رہا ہے

صوبۂ فوکین کے شمال میں یہ فن بہت ترقی یافتہ ہے، حتےٰ کہ یہاں سو سو ڈالر فی پونڈ کی قیمتی چار بھی فراہم ہو سکتی ہے۔ یہ قیمتی چار ایک ایک اونس کی چھوٹی چھوٹی ڈبیوں میں ملتی ہے اور تحفتہً احباب و اعزہ کو بھیجی جاتی ہے۔ جب کوئی نہایت ہی معزز دوست آتا ہے تو اس چار سے اس کی تواضع کی جاتی ہے، لیکن بعض امراء اپنے آپ کو اسی چائے کے عادی بنا لیتے ہیں اور آخر کار بالکل تباہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس چار کے پینے کے ظروف بھی خاص ہوتے ہیں، اس کی پیالی چینی کی نہیں بلکہ مٹی کی ہوتی ہے اور انگشتانہ سے زیادہ بڑی نہیں ہوتی۔ مٹی کی پیالی اس لئے استعمال کی جاتی ہے کہ اس میں چار کی خوشبو بس جاتی ہے اور لطف دوبالا ہو جاتا ہے، چانڈو کی نے کی طرح یہ پیالی جتنی پُرانی ہوتی ہے اتنی ہی اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ بعض شوقین بہت پُرانی پیالیوں کی قیمت دو دو سو ڈالر تک ادا کرنے کے لئے طیار ہو جاتے ہیں۔ ان پیالیوں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اگر محض گرم پانی ڈال کر پیا جائے تو بھی اس میں چار کا مزہ پیدا ہو جاتا ہے۔

یہ چار تلخ ہوتی ہے، لیکن اس کے پینے کے بعد ایک خاص قسم کی لذت و خوشبو حلق میں پیدا ہو جاتی ہے جو کافی دیر تک باقی رہتی ہے اور اسی کیفیت کے لئے بعض امراء اپنی ساری دولت تباہ کر ڈالتے ہیں۔ ایک مبتدی کے لئے تو اس چار میں کوئی لذت نہیں پائی جاتی، لیکن جب رفتہ رفتہ وہ اس کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ زندگی کی لذت عبارت ہے اسی چار سے۔ گویا یوں سمجھئے کہ یہ چار ایک قسم کی کوکین ہے کہ منہ لگ جانے کے بعد اس کا چھٹنا ممکن نہیں۔

یہاں کے پرانے چار نوش اتنے ماہر ہوتے ہیں کہ صرف ایک گھونٹ پیکر بتا سکتے ہیں کہ چاء کس قسم اور کتنی قیمت کی ہے، کہاں کی پیداوار ہے اور کس موسم میں چنی گئی ہے، نیز یہ کہ اس کی طیاری میں، دریا، مینبہ، چشمہ یا کنویں میں سے کہاں کا پانی استعمال کیا گیا ہے۔

چاء کی تین خصوصیتیں ہر شوقین چاء پینے والے کے سامنے رہتی ہیں۔ رنگ مزہ اور خوشبو اور وہاں کی چار دانیوں پر انھیں تین خصوصیات کا بیان نہایت خوشخط تحریر میں درج ہوتا ہے۔

اکثر و بیشتر مہمان خود ہی پانی کو جوش دیتا ہے کیونکہ نوکر نہیں سمجھ سکتے کہ قیمتی چاء کے لئے پانی کتنا ابلنا چاہئے کہ اس کی یہ تینوں خصوصیات باقی رہیں۔

چی کیانگ اور کیانگسو صوبوں میں بجائے سیاہ چاء کے سبز چاء کا استعمال زیادہ ہے، لیکن پینے اور پلانے کا طریقہ ایک ہی سا ہے اور پیالیوں میں گرفت کے لئے دستہ کہیں نہیں پایا جاتا۔ یہاں کے چاء خانوں کی دیواریں عموماً سفید ہوتی ہیں جن پر سیاہ پالش کی ہوئی لکڑی کے بیل بوٹے قایم کئے جاتے ہیں۔ یہ چاء خانے جھیلوں کے اندر چھوٹے چھوٹے جزیروں کی صورت میں پائے جاتے ہیں اور مختلف قسم کے رنگین پلوں کے ذریعہ سے ان تک پہونچتے ہیں۔

ان چاء خانوں میں خلوت خانے بھی ہوتے ہیں جہاں شور و شغب سے علٰحدہ لوگ ہر قسم کی باتیں کر سکتے ہیں۔

ٹین ٹسین میں مزدوروں کے لئے ایک بہت بڑا قدح چاء سے بھر دیا جاتا ہے اور وہ اس میں پیالیاں ڈبو ڈبو کر چاء نکالتے ہیں۔

پیکنگ میں بعض لوگ نلکیوں کے ذریعہ سے چاء لیٹ کر پیتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھالی میں چاء کی پیالی کے ساتھ ہی چانڈو پینے کا سامان بھی رکھدیا جاتا ہے اور لوگ لیٹے ہی لیٹے چانڈو اور چاء دونوں ایک ساتھ پیتے رہتے ہیں۔

مذہب اور فلسفۂ مذہب

ان دونوں میں پہلی کتاب اڈیٹر نگار کی تصنیف ہے، دوسری سید مقبول احمد بی۔ اے کی اور نظریۂ مذہب سمجھنے کے لئے ان کا مطالعہ ضروری ہے۔ ہر ایک کی قیمت ایک روپیہ فی کاپی۔ دونوں ایک ساتھ طلب کرنے پر محصول ڈاک معاف۔

منیجر نگار لکھنؤ

مومیائی کے سفوف سے علاج

عربی میں مومیاء اس لاش کو کہتے ہیں جو مسالوں کی مدد سے محفوظ کر لیجاتی ہے اور امتداد زمانہ کے اثر کو قبول نہیں کرتی۔

مومیاء، دراصل یونانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی "حافظِ اجسام" کے ہیں، لیکن بعض اہل لغت اسے عربی کا لفظ بتاتے ہیں جو موم سے بنایا گیا ہے اور چونکہ لاشوں کے محفوظ رکھنے میں موم سے بھی کام لیا جاتا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ مومیاء کا مادہ موم ہی ہو۔

علماء آثار کی اصطلاح میں مومیاء سے مراد وہ جسم ہے جو مسالوں کی مدد سے محفوظ کر لیا گیا ہو۔ یہ فن اہل مصر کا مخصوص فن سمجھا جاتا ہے اور قبل مسیح پانچ ہزار سال بلکہ اس سے بھی قبل وہاں اس کا سراغ ملتا ہے۔ یعنی وہ زمانہ جب مصر شمالی و جنوبی دو حصوں میں منقسم تھا۔

اُس زمانہ میں یہ فن بہت ناقص تھا۔ لاش کے دونوں گھٹنے اُٹھا کر ٹھوڑی سے ملا کر اور دونوں ہاتھ منھ پر رکھ کر باندھ دیتے تھے اور اس طرح گٹھری بنا کر جسم کو دھوپ میں خشک کر لیتے تھے۔ خشک ہونے کے بعد جسم کو تابوت میں رکھ دیتے تھے اور اسی کے ساتھ کچھ غذا بھی اور اسلحہ بھی — بعد کو جب اس فن نے زیادہ ترقی کی تو پیٹ کی آلائش نکال کر روغن نفط میں جسم کو ڈال دیتے تھے اور پھر کسی حیوان کی کھال یا چٹائی میں لپیٹ کر دفن کر دیتے تھے۔

حقیقی مومیائی کا فن دراصل تقریباً مسیح سے چار ہزار برس قبل شروع ہوا۔ اس عہد کی مومیائی شدہ لاشیں فنِ حنوط اور طریقِ دفن دونوں حیثیتوں سے زیادہ ترقی یافتہ صورت میں نظر آتی ہیں۔

اس فن کے متعلق ہیرو ڈوٹس اور دوسرے قدیم مورخوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جسم سے دماغ اور پیٹ کی آلائش نکال کر تیل میں ڈال دیتے تھے، پھر کھجور کے پانی سے دھو کر کچھ مسالے چھڑک دیتے تھے اور پیٹ کے اندر دار چینی وغیرہ بھر کر اسے سی دیتے تھے۔ اس کے بعد نمک کے پانی میں ستر دن تک لاش کو رکھتے تھے اور پھر صاف کر کے خوشبودار چیزیں ملکر ریشمی چادروں میں لپیٹ دیتے تھے۔ اگر کسی عورت کا جسم ہوتا تو اس کے لب و رخسار کو سُرخ رنگ سے رنگ دیتے تھے۔ اگر مرنے والا کوئی معمولی آدمی ہوتا تو صرف نمک کے پانی میں رکھ کر یہ عمل ختم کر دیا جاتا۔

بعد کو جب اس فن نے اور ترقی کی تو دماغ اور پیٹ کی آلایش کو بھی حنوط کیا جانے لگا اور لاشیں بجائے دفن کرنے کے محلوں میں رکھی جانے لگیں۔ شاہانِ مصر کی لاشوں کو حنوط کرنے کی رسم ۳۵۸ قبل مسیح میں ختم ہوگئی لیکن یہ رواج دوسرے ملکوں میں اس کے بعد بھی قایم رہا، چنانچہ امریکہ کے اصلی باشندوں میں جن کا تمدن بہت کچھ قدیم مصری تمدن سے متاثر ہوا تھا، یہ فن اس کے بعد بھی قایم رہا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تاہیٹی میں امراء کے جسم حنوط کر کے معابد میں رکھے جاتے تھے۔

تبت میں بھی یہی قاعدہ ہے کہ جب لاما مرجاتا ہے تو اس کی لاش کو نمک کے پانی سے صاف کر لیتے ہیں اور پھر کپڑوں میں لپیٹ کر اس کو بیٹھی ہوئی حالت میں دفن کرتے ہیں۔ لاش کے ساتھ اس کی بعض ایسی چیزیں بھی رکھ دیتے ہیں جن سے وہ اپنی زندگی میں زیادہ کام لیا کرتا تھا۔

افریقہ کے بعض حصّوں میں بھی یہی رواج پایا جاتا ہے اور امرا کی لاشیں حنوط کر کے دفن کی جاتی ہیں۔

یہ تو ہوا مومیائی شدہ لاشوں کا بیان، لیکن اب اس کے سفوف سے علاج کرنے کا حال بھی سنئے۔

قدیم زمانہ میں علاج کے عجیب و غریب طریقے رائج تھے اور اُس وقت کی بعض دوائیں بھی بالکل انوکھی ہوتی تھیں، لیکن ان دواؤں سے شاید سب سے زیادہ عجیب مصری مومیائی شدہ لاش کا سفوف تھا۔

اُنیسویں صدی کے اخیر تک مومیائی کے سفوف کی اتنی مانگ رہی کہ فرانس میں اس کو پورا کرنے کے لئے "مومیائی" طیار ہونے لگی۔ یہ سفوف زیادہ تر پھیپھڑے کی بیماریوں میں استعمال ہوتا تھا اور اس سے فایدہ بھی ہوتا تھا۔ غور کرنے سے اس فایدہ کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ کے معالجین رآل یا نفط کے اثرات سے پوری طرح واقف تھے اور ارض بابل اور بحر مُردہ کے ساحلی مقامات پر اس کی تلاش میں اکثر اطبار جایا کرتے تھے، کیونکہ خالص رآل یہیں ملتی تھی۔

اس کا علم سب سے پہلے یونان کے اطبار کو ہوا تھا اور بعد کو عرب اطبار نے بھی ان سے متاثر ہو کر رآل یا نفط کے ذریعہ سے علاج و معالجہ اختیار کیا، چنانچہ ابو منصور، مشہور عرب طبیب نے سلانِ دم اور پھیپھڑوں کے امراض کے لئے نفط کو بہت مفید بتایا ہے ۔ مصر میں صرف ایک جگہ ایسی تھی جہاں نفط ملسکتا تھا لیکن فراعنہ نے اس مقام کو محفوظ کر لیا تھا اور سال میں صرف ایک بار یہاں سے نفط حاصل کرنے کی اجازت ملتی تھی۔

جب عربوں کو اس چیز کی جستجو ہوئی اور فراعنہ کی لاشیں دستیاب ہوئیں تو معلوم ہوا کہ فراعنہ کی مومیائی شدہ لاشوں میں رآل یا نفط بہ کثرت پایا جاتا ہے اور اس طرح مومیائی شدہ لاش کے سفوف سے کام لینا شروع کیا گیا۔ لیکن چونکہ عوام اس حقیقت سے واقف نہ تھے کہ فایدہ دراصل نفط سے ہوتا ہے اس لئے لاشوں کے سفوف ہی کو وہ مفید سمجھنے لگے اور یہ خبط اتنا بڑھا کہ بعض مریضوں کو لاش کا گوشت تک کھلا دیا گیا۔

دسویں صدی کے ایک طب کی کتاب میں مومیائی بنانے کی ایک خاص ترکیب یہ لکھی گئی ہے کہ "سُرخ بال والے گورے رنگ کے نوجوان کو ۳۰ سال تک پھل کھلانے کے بعد، شہد اور مختلف دواؤں سے بھرے ہوئے پتھر کے ظرف میں بند کر دیا جائے اور ایک سو بیس سال کے بعد اس لاش کو نکالا جائے"۔ یوروپ کا فن طب بھی چونکہ عربوں سے متاثر ہوا تھا اس لئے یہاں بھی اول اول اسی قسم کی دواؤں سے علاج کیا جاتا تھا۔ چنانچہ بعض مغربی ڈاکٹر بھی انسانی خون، بارسیدہ ہڈیوں اور مومیائی کے سفوف سے علاج کرتے تھے ـــــ چونکہ مصر کی اصلی مومیائیوں کا دستیاب ہونا بہت دشوار تھا اور ان کی مانگ بہت تھی، اس لئے مصر میں ان لوگوں کی لاشیں بھی مومیائی کی جانے لگیں جو طاعون اور چیچک وغیرہ متعدی امراض میں مبتلا ہو کر مر جاتے تھے، لیکن یوروپ کے اطباء ان مومیائیوں کے لینے سے اجتناب کرتے تھے۔ مصریوں کا خیال تھا کہ اگر عیسائیوں کو اصلی مومیائیاں ملگئیں تو وہ انکو کھا کر مصر پر غالب آجائیں گے۔ جب مومیائیوں کا حصول مصر سے ناممکن ہو گیا تو مغربی ڈاکٹروں نے خود مختلف قسم کی مومیائی طیار کرنا شروع کی اور حسب بیان Paracelsus بہترین مومیائی ان لوگوں کی سمجھی جاتی تھی جن کو پھانسی دی گئی ہو۔ شاہ رودلف ثانی کے درباری ڈاکٹر Oswald Kroll کی بھی رائے یہی تھی کہ سب سے اچھی مومیائی اس سُرخ بال والے انسان کی ہوتی ہے جسکو پھانسی دیگئی ہو۔ مومیائی کا سفوف بالعموم سفید شراب میں حل کر کے استعمال کیا جاتا تھا، اور ۱۸۳۴ء تک آسٹریا کے دوافروش کے یہاں برابر دستیاب ہو سکتا تھا۔

یاد رکھئے!

بیوٹرین رجسٹرڈ

کیل، جھائیوں، بزنما داغوں، پھوڑے پھنسیوں، بھورے تل، مہاسوں، داد، چنبل، خارش، اگزیمہ اور جلدی بیماریوں کا مکمل علاج ہے

قیمت ۲ روپیہ، بڑا سائز ۴ روپیہ

اور

بیوٹرین سنو رجسٹرڈ

آپ کی خوبصورتی و ملاحت کو قایم رکھنے کے لئے ہے

قیمت پندرہ آنے

کیمیکل اسپیشلسٹ کیمیکل ورکس کمپنی بمبئی

سولہ بیت ۱۰ ایس۔ بی۔ احمد، نہر سعادت خاں، حوض قاضی دہلی

چھوٹا اشتہار دینا حرام ہے بس اس سے زیادہ میرے پاس کوئی ثبوت صداقت نہیں ہے۔ ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔

معجون عنبری یہ دوا دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے ولایت تک اسکے مداح موجود ہیں۔ دماغی کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے جوان، بوڑھے، سب کھاتے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں سیکڑوں قیمتی ادویات اور کشتہ جات بیکار ہیں۔ اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پاؤ بھر گھی ہضم کر سکتے ہیں، اس قدر مقوی دماغ ہے کہ کہنے کی باتیں بھی خود بخود یاد آنے لگتی ہیں، اسکو مثل آبحیات کے تصور فرمایئے۔ اسکے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے۔ ایک شیشی چھ سات سیر خون آپ کے جسم میں اضافہ کر دیگی اسکے استعمال سے ۱۸ گھنٹہ کام کرنے سے مطلق تھکن نہ ہوگی۔ یہ دوا رخساروں کو مثل گلاب کے پھول کے سُرخ اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا نہیں ہے ہزاروں ایوس الصلاح اسکے استعمال سے بامراد ہو کر مثل پندرہ سولہ سال کے جوان بن گئے یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے کر آپ صبر و تحمل نہیں کر سکتے، القصہ اسکی صفت تحریر میں نہیں آسکتی تجربہ کر کے دیکھ لیجئے اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔

قیمت فی شیشی چار روپیہ (للعہر)

(نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دواخانہ مفت منگایئے۔

میں اللہ کو حاضر و ناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے نقلوں سے ہوشیار رہئے۔ میری ۲۵ سالہ شہرت پر غور فرمایئے۔

پتہ:۔ حکیم ثابت علی شیخ زبان خوش کلام (عالم شنوی مولانا روم) محمود نگر ۳ لکھنؤ

اندھیری دُنیا

زمیں بھی اندھیری، فلک بھی اندھیرا
ہر اک سو فضا میں ہے ظلمت کا ڈیرا
نہ باغوں میں پھولوں کی رنگین محفل
نہ شاخوں پہ چڑیوں کا باقی بسیرا
ہے سنسان یکسر فضا زندگی کی
ہلاکت کا اُڑتا ہے سر پہ پھریرا
جھکی پڑ رہی ہے گھٹا ہر طرف سے
کہ شیطاں نے اپنی لٹوں کو بکھیرا
دیا عقل و حکمت کا سب بجھ چکا ہے
کچھ اس طرح آندھی نے دُنیا کو گھیرا

پریشان یزداں ہے عرشِ بریں پر
ادھر خندہ زن اہرمن ہے زمیں پر

ہے انساں کی مجبوریوں کی کہانی
یہ مٹی میں ملتی ہوئی نوجوانی،
وہ، قیمت نہیں جس کی کون و مکاں بھی
ہے پانی سے ارزاں وہی زندگانی،
جوانی مگر کھیلتی ہے لہو سے
لہو میں غضب کی ہے شعلہ فشانی
خرد نے بجھا دی محبت کی مشعل
ہوس کی دلوں پر ہوئی حکمرانی
اندھیرے میں انسان حیران و ششدر
نہ کچھ کام آئی مگر نکتہ دانی

نہیں آنکھ فطرت کی کچھ این و آں پر
حیات اپنی کشتی ہے موجِ رواں پر
تھپیڑوں کو سہتی چلی جا رہی ہے
کوئی ڈوبتی ہے یہاں پر وہاں پر
مگر زندگی کی حقیقت نہ پوچھو
کہ چھائی ہوئی ہے یہ کون و مکاں پر
وہ قوت، مٹاتی ہے جو آج دُنیا
وہی سایہ افگن ہے لیکن جہاں پر
بھڑکتی ہے جو آگ سینہ میں اپنے
وہی نورِ خورشید ہے آسماں پر

اُجالا اسی آگ سے اپنے گھر میں
اسی سے رواں قافلہ دشت و در میں

(پروفیسر) شمس شیدائی سہسوانی

خلاقِ کائنات سے

یہ کرب میں ڈوبے ہوئے شہروں کے سویرے
صبحوں کے کفن رات کے پُر ہول اندھیرے

بجھتی ہوئی دوکانیں سلگتے ہوئے بازار
فصلیں بھی دھواں دھار ہیں خرمن بھی دھواں دھار

ہنستے ہوئے لب، زہر اُگلتے ہوئے سینے
طوفاں کے تراشیدہ کناروں پہ سفینے،

چنگیز ہی چنگیز قبا پوش و کلہ دار
زخموں کے بھی نیلام، سنانوں کے بھی بازار

کعبہ بھی سیہ پوش، کلیسا بھی سیہ پوش
طوفان ہی طوفان سفینوں سے ہم آغوش

سجدوں کی یہ ذلت، یہ وظیفوں کی کراہیں
اُٹھتے ہوئے سورج پہ یہ بھرپور نگاہیں،

زنجیروں کے ماتم میں مناجات کی تسکین
مرہم کی بھی توہین ہے، زخموں کی بھی توہین

یہ کلفتِ احساس تبسم سے فغاں تک
چھایا ہے اندھیرا ترا سورج ہے جہاں تک

ہو صبحِ اسیری تو ہیں یکساں عجم و چین،
سونے کے درخشندہ جنازے ہیں سلاطین

ہیروں سے چمکتی نہیں "میری" ہو کہ "شاہی"
ماتھوں سے ٹپکتی ہے شمیروں کی سیاہی

غم بھی مرا مجبور، مرا صبر بھی لاچار
شعلوں میں بھی انگار ہے شبنم میں بھی انگار

کھیتی بھی کہیں خوشۂ گندم سے جلی ہے
کیا "قادرِ مطلق" ترا انصاف یہی ہے؟

پروفیسر شور

کلامِ شفقت کاظمی:

راحتِ دل کی ہر طلب وجہِ ملال ہو گئی
تیرے بغیر زندگی مجھ کو وبال ہو گئی

تیری جفا کی سختیاں مایۂ شوق ہو چکیں
تیرے کرم کی آرزو خواب و خیال ہو گئی

دل مائلِ فریاد و فغاں ہو نہیں سکتا
خوش ہو کہ ترا رازِ عیاں ہو نہیں سکتا

ہم اُس کافر کو دیں کیوں مفت الزامِ جفا کاری
ہمارے حال کی دشمن تھی خود اپنی وفاداری

زمانہ ہو چکا تیری جدائی کو مگر اب تک
مری دنیائے دل پر ہے وہی افسردگی طاری

گزر جائے گا دنیا سے دلِ مجبور غم آخر
نہ اُٹھی ہے نہ اُٹھے گی تری فرقت کی دشواری

سمجھ لینا کہ اُن کا آستاں نزدیک آ پہونچا
جہاں اے کاظمی ہونے لگیں تیرے قدم بھاری

غزل : احمد ندیم قاسمی

یہ میری بے بصری ہے، کہ تیری بے خبری
مرا جنوں، عملی ہے، تری خرد نظری

اب آفتاب کی باری ہے، رات بھاری ہے
میں دیکھتا رہوں کب تک ستارۂ سحری

یہ اہتمامِ علاج ایک سعیِ خام نہ ہو،
کہ اب تو درد ہی کرتا ہے میری چارہ گری

یہ ایک قطرۂ شبنم ہے آفتاب بدست
بہت قریب سے دیکھو جو فطرتِ بشری

جہاں سے پھول گرا تھا، وہیں کلی چٹکی
اگر ہے فتنہ یہی تو نثارِ فتنہ گری

یہ تجھ کو دیکھ کے کیوں لوگ مجھ کو دیکھتے ہیں!
یہ تیری جلوہ گری ہے کہ میری پردہ دری

فلک پہ ٹوٹے ستارا۔ زمیں پہ اشک گرے
مرے ندیم! یہی ہے کمالِ بخیہ گری!

کلام باسط بھوپالی :-

عشق شہیدِ ذوقِ نظر ہے، عشق کی دُنیا کیا کہئے
ذرہ ذرہ چشمِ تماشا، کیفِ تماشا کیا کہئے

اب کوئی آیا، اب کوئی آیا، اب دل ٹھہرا، اب دل ٹھہرا
شام سے وہ اک خواب کا عالم، خواب کی دنیا کیا کہئے

اپنے غموں سے فرصت کب ہے ظالم دنیا والوں کو
اپنا فسانہ کون سُنے گا، اپنا فسانا کیا کہئے

اولِ شب تو جیسی گزری، مرتے جیتے کٹ ہی گئی
لیکن آخر آخرِ شب، وہ دل کا تڑپنا کیا کہئے

اِس ظلم پہ قرباں لاکھ کرم اس لطف پہ صدقے لاکھ ستم
اُس درد کے قابل ہم ٹھہرے جس درد کے قابل کوئی نہیں

پھر دل کی تڑپ کا مطلب کیا؟ پھر ذوقِ طلب کا حاصل کیا؟
منزل کی تمنا کیا معنی؟ جب سامنے منزل کوئی نہیں

قسمت کی شکایت کس سے کریں، وہ بزم ملی ہے ہم کو جہاں
راحت کے ہزاروں ساتھی ہیں، دکھ درد میں شامل کوئی نہیں

بیزار کہیں یوں ہوتے ہیں اربابِ وفا کی کثرت سے؟
یا رحم کے قابل دنیا تھی، یا ظلم کے قابل کوئی نہیں

رونقِ بزمِ کائنات حاصلِ نغمۂ حیات
سوز مری نگاہ کا ساز ترے شباب کا

یاں یہ وفورِ بیخودی، واں وہ غرورِ دلبری
فکر کسے سوال کی ہوش کسے جواب کا

کچھ نہ کچھ ہوا آخر دورِ آسماں اپنا
ڈھونڈنے چلے اُن کو مل گیا نشاں اپنا

دیکھ کر انھیں باسط ہم کسی کو کیا دیکھیں
اب کہاں کسی کے ہم اب کوئی کہاں اپنا

نہ ہٹا ساغرِ گل رنگ لبوں سے میرے
تجھ کو تو ہوش ہے ساقی جو مجھے ہوش نہیں

توبہ، یہ منزلِ ویرانِ محبت توبہ
وہ نہیں، میں نہیں، نظارہ نہیں، ہوش نہیں

سرسری تبصرہ

مطبوعات رایل ایجوکیشنل بک ڈپو دہلی

خاکستر جناب بہار کوٹی کے اُنیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شروع میں جناب قیسی رامپوری کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے بہ حیثیت مجموعی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بہار کے افسانے زیادہ تر واقعات پر مبنی ہوتے ہیں اور اس لئے تاثر سے خالی نہیں ہوتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قیسی صاحب کی یہ رائے غلط نہیں ہے، لیکن اس میں تھوڑے سے اضافہ کی ضرورت ہے اور وہ یہ کہ جن انسانوں میں وہ رومانیت یا ادبیت پیدا کرنا چاہتے ہیں، ان میں ضرورت سے زیادہ تصنع پیدا ہو جاتا ہے اور یہ شاید اس لئے کہ وہ "واقعات" نہیں ہوتے۔ بہار صاحب کا انداز تحریر کافی دلکش ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کافی تامل کے بعد افسانہ نگاری شروع کی ہے۔ طباعت وکتابت پاکیزہ۔ قیمت دو روپیہ۔

برہنہ جناب قیسی رامپوری کا ناول ہے جس میں انھوں نے موجودہ جنگ کے پس منظر پر انسانیت کی بے دردی کے واقعات کو پیش کیا ہے۔ جناب قیسی بڑے کہنہ مشق انشا پرداز ہیں اور فسانہ نگار وناول نویس کی حیثیت سے وہ ملک میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔

ان کا انداز تحریر اور اسلوب بیان بہت دلچسپ ہوتا ہے اور وہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر بات کو نئے زاویہ سے پیش کریں جو آسان بات نہیں۔ یہ ناول وقت کی پیداوار ہے اور ہر لحاظ سے مطالعہ کے قابل۔ قیمت دو روپیہ۔

رونق جناب قیسی رامپوری کا ناول ہے جس کو انھوں نے بدکاروں کے نام معنون کیا ہے تاکہ اس طرح نیکوکاری کا پس منظر روشن ہو سکے۔ گویا تعلیم اخلاق کے لئے انھوں نے علاج بالضد کے طور پر ناول لکھا ہے۔ لیکن بڑی مشکل ہوگی اگر کسی نے "علاج بالمثل" کی طرف توجہ کر کے نیکوکاروں کا کچا چٹھا بیان کرنا شروع کر دیا۔

جناب قیسی کی ناول نویسی اور ان کے انداز تحریر کی تمام وہ خصوصیات جنھوں نے ان کو صف اول کے

افسانہ نگاروں میں شامل کر دیا ہے، اس کتاب میں بھی پائی جاتی ہیں اور قطع نظر اس سے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے یا نہیں، مطالعہ کے قابل ہیں۔ قیمت تین روپیہ۔

پھندا ناول ہے قیسی رامپوری کا، اس میں دو بھائیوں کے کردار پیش کئے گئے ہیں، جن میں سے ایک دنیا دار اور دوسرا مذہبی، ایک تیسرا کردار "اشتراکی" بھی شامل کر دیا گیا ہے جسے تقابل و توازن کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہئے۔ قیسی رامپوری کی خصوصیات ناول نویسی اس میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں، یہاں تک کہ ان کے بیان کی وہ اُلجھنیں بھی ہیں جنھیں وہ ندرت پسندی کی بنا پر شاید خود بھی دور کرنا پسند نہیں کرتے۔ قیمت ۴ عا

راج محل پبلشرز جموں

روح صہبائی جناب اثر صہبائی ام۔ اے، ال ال بی کی تمام اُن نظموں کا مجموعہ ہے جو ۲۳ء سے ۴۵ء تک ان کے قلم سے نکلیں۔ اس کتاب کو انھوں نے چار حصّوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے کا نام نغمہ و نالہ ہے، دوسرے کا بام رفعت، تیسرے کا نور و نکہت اور چوتھے کا ذکر و فکر اور ان چاروں حصّوں میں ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں، اور ہر غزل و نظم پر تاریخ بھی درج ہے، جس سے انکی شاعری کی تدریجی ترقی کا پتہ چل سکتا ہے۔

جناب اثر صہبائی بڑے مشہور کہنہ مشق شاعر ہیں اور اس اسکول سے تعلق رکھتے ہیں جو قدیم و جدید دونوں پہلو دبائے ہوئے ہے۔ ان کے کلام کی بڑی خصوصیت لہجہ کی صداقت اور اثر اندازی ہے اور معنوی حیثیت سے وہ ایک مفکر دماغ کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔

راجکماری چمپا راجہ مہدی علی خاں کی پانچ کہانیوں کا مجموعہ ہے، جسے راج محل پبلشرز جموں نے شایع کیا ہے۔ راجہ صاحب کہانیاں لکھنے کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں اور اس حیثیت سے وہ ملک میں کافی روشناس ہو چکے ہیں، زبان کی سادگی، انداز بیان کا بے ساختہ پن اور پھر پلاٹ کی دلکشی یہ تمام باتیں پورے حُسن کے ساتھ ان کی کہانیوں میں پائی جاتی ہیں۔ قیمت چھ آنہ۔

بونوں کا قلعہ راجہ مہدی علی خاں کی پانچ کہانیوں کا مجموعہ ہے جن میں وہی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کے لئے راجہ صاحب کا قلم قبول عام حاصل کر چکا ہے۔ قیمت چھ آنے

ہمارے آس پاس ریاست جموں کا ادارۂ اشاعت جو راج محل پبلشرز کے نام سے موسوم ہے، اس میں شک نہیں کہ بڑی خدمت انجام دے رہا ہے اور بہت مفید کتابیں اور رسالے نہایت سلیقہ کے ساتھ شایع کرتا رہتا ہے۔

دُنیا ہماری پردیسی کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے اور راج محل پبلشرز نے اسے بھی شایع کیا ہے۔ پردیسی مشہور افسانہ نگار ہیں اور سادگی بیان کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ان افسانوں کا پس منظر کشمیر کے حالات ہیں اور اس لئے بعض ایسی تلخ حقیقتیں پیش کرتے ہیں، جن کا مطالعہ کئے بغیر ہم کوئی سماجی اصلاح نہیں کر سکتے۔

ہمالیہ کی گود میں ساگر چند گورکھا کے اٹھارہ افسانوں کا مجموعہ ہے، جنھیں باتیں کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس کا نام ہمالیہ کی گود اس لئے رکھا گیا کہ اس میں تمام وہ واقعات و تاثرات قلمبند کئے گئے جو کوہستان ہمالیہ کی وادیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ساگر چند صاحب جو کچھ لکھتے ہیں بڑے دلکش انداز میں لکھتے ہیں اور سادگی و پُرکاری ان کی تحریروں کی وہ خصوصیت ہے جو ان کے دوسرے ہمعصر فسانہ نگاروں اور ادیبوں میں خال ہی خال کہیں نظر آتی ہے۔ کوہستان ہمالیہ کی باتیں کرنے کے لئے ایسے ہی شخص کی ضرورت تھی جو کوہستانی ندی ہی کی تیز روانی کی طرح سب کچھ کہہ جائے۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنے۔

پنجم مدھم محمد عمر صاحب کے سات ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ جنھوں نے عرصہ ہوا اپنے مرحوم رفیق کار نور الٰہی کی محبت میں سب سے پہلے تمثیل نگاری کو فنی حیثیت سے روشناس کرایا تھا، ان میں سے بعض ڈرامے ماخوذ ہیں، لیکن اکثر طبعزاد۔ ڈرامے بہت چھوٹے چھوٹے اور دلچسپ ہیں۔ لیکن طویل مکالموں نے ان کی ڈرامائی حیثیت کو کمزور کر دیا ہے۔ قیمت دو روپیہ۔

نغمۂ جاوید بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ ہے جسے مرزا جعفر علی خاں اثر نے کیا اور راج محل پبلشرز جموں نے شایع کیا۔

بھگوت گیتا کی اہمیت اور جناب اثر کا زور قلم دونوں اپنی جگہ تعارف سے بے نیاز ہیں۔ قیمت تین روپیہ

نفیس اکاڈیمی، حیدر آباد دکن

جمال الدین افغانی اس مجموعہ میں بارہ مشاہیر علم و ادب کے مقالے شامل ہیں جن میں "جمال الدین افغانی" کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے۔ جمال الدین افغانی کی شخصیت سے یونتو سبر شخص واقف ہے، لیکن ان کے مخصوص کارناموں سے لوگوں کو بہت کم آگاہی حاصل ہے، اس لئے یہ کتاب بڑی ضرورت کو پورا کرتی ہے اور نفیس اکاڈیمی حیدر آباد قابل مبارکباد ہے۔

قیمت تین روپیہ

تکونا دیس ابراہیم جلیس کے پندرہ مضامین کا مجموعہ ہے، جن کو اگر ہم چاہیں تو افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ابراہیم جلیس ایک مخصوص رنگ کے طنز نگار ہیں اور وہ سماج کے حالات پر بڑے دلکش پیرایہ میں تنقید کر جاتے ہیں۔

نگار میں بھی ان کے مضامین کبھی کبھی شایع ہوتے ہیں اور بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

بہ کرور بھکاری مجموعہ ہے ابراہیم جلیس کے ۱۴ افسانوں کا، جو اپنے مصنف کے رنگ تحریر کے پوری طرح حامل ہیں۔ طنزیاتی رنگ کے فسانے یا اسکیچ لکھنا آسان نہیں اور اُردو میں یہ چیز تقریباً مفقود تھی، لیکن ابراہیم جلیس نے اس میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے اور اتنا صاف و بے عیب طنزیاتی فسانہ نگار ہمارے یہاں شاید کوئی دوسرا موجود نہیں۔ قیمت دو روپیہ بارہ آنہ

تصورات اقبال شاغل فخری نہایت ذہین نوجوان تھے اور علم و ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے لیکن ان کا یہ ذوق پختہ نہ ہوا تھا کہ انتقال کر گئے۔ مرحوم نے اقبال کا مطالعہ نہایت عمیق نگاہ سے کیا تھا اور اپنے نتائج مطالعہ کو وہ قلمبند کرتے جاتے تھے۔ یہ کتاب اسی یادداشت کا نتیجہ ہے جسے ان کے دوست عمران انصاری نے مرتب کیا ہے۔ اقبال پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جائیں گی لیکن اس حیثیت سے کہ یہ انتہائی ذاتی خلوص کے نتائج ہیں، اپنی جگہ سب سے الگ رکھتے ہیں۔ شاغل فخری بڑی شگفتہ و رنگین زبان لکھتے تھے، اس لئے یہ کتاب خالص ادبی حیثیت سے بھی خاص قیمت رکھتی ہے۔ قیمت ؎

ہندوستانی پبلشرز دہلی

ایک حمام میں ناول ہے خواجہ محمد شفیع دہلوی کا لکھا ہوا جسے ہندوستانی پبلشرز دہلی نے شایع کیا ہے۔ خواجہ صاحب اس وقت دہلی کے تنہا زباندان ہیں جن کی کتابوں سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ دہلی پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے۔

یہ ناول معاشرتی رنگ کا ہے اور نتیجہ کے لحاظ سے سبق آموز۔ زبان اور بیان کے لحاظ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ خواجہ صاحب کا نام ضمانت کے لئے کافی ہے۔ قیمت دو روپے

مجھے خرید لو شوکت تھانوی کے دس مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جسے ہندوستانی پبلشرز دہلی نے شایع کیا ہے۔

شوکت صاحب مشہور مزاحیہ نگار ہیں اور تعارف سے بے نیاز۔ وہ اپنے رنگ میں جو کچھ لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔

معاہدہ ہند و برطانیہ سر سید سلطان احمد کی تصنیف ہے جس میں ہندوستان اور برطانیہ کے باہمی سیاسی تعلقات کی تاریخ نہایت واضح الفاظ میں پیش کی گئی ہے اور جس کا مطالعہ ہندوستان کا مستقبل سمجھنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔

ہندوستانی پبلشرز دہلی کا ملک کو ممنون ہونا چاہئے کہ اس نے اس کتاب کی اشاعت سے ایک ایسے ماہر سیاسیات کے خیالات پیش کر دئے، جس کی قابلیت کا اعتراف ان لوگوں کو بھی ہے، جو اُن کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں - قیمت ڈیڑھ روپیہ -

شب تاب جناب مجاز کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے۔ مجاز اسوقت تک کے نوجوان انقلابی شاعروں میں ایک خاص رنگ کے مالک ہیں اور اس میں شک نہیں کہ خوب کہتے ہیں۔

ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سب کچھ اسی زبان، اور اسی انداز میں کہتے ہیں جس سے ہمارے دل و دماغ آشنا ہیں اور اس لئے ہم ان کے کلام سے بہت زیادہ لطف اُٹھاتے ہیں۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

دوسرے اداروں کی مطبوعات

ما بدولت خود نوشتہ سوانح حیات ہیں، جناب شوکت تھانوی کی اس کتاب میں انھوں نے بچپن سے لیکر اس وقت تک کے حالات لکھے ہیں اور کافی دیانت کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب میں وہ اپنا مزاحی رنگ زیادہ قایم نہ رکھ سکتے تھے، تاہم ان کی فطری شوخی اس میں بھی نمایاں ہے اور ہلکے مطالعہ کے لئے اس میں کافی وزن پایا جاتا ہے۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔ ملنے کا پتہ: ادارۂ فروغ اُردو لاہور۔

سرخ افسانے اُنیس روسی افسانوں کا ترجمہ ہے جسے اسرار احمد آزاد نے کیا اور نیا کتاب گھر اُردو بازار دہلی نے شایع کیا۔

یہ افسانے دوران جنگ میں پروپاگنڈا کی غرض سے لکھے گئے تھے، اس لئے ان میں روسی افسانہ نگاری کی قدیم خصوصیات تو نہیں پائی جاتیں، لیکن ان سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ناتسیت کے خلاف روس کے عوام میں کیا جذبات کام کر رہے تھے اور ان سے حکومت نے کتنا فایدہ اُٹھایا۔

ترجمہ بہت صاف و شگفتہ ہے اور روس کے موجودہ حالات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ان افسانوں میں کافی سامان دلچسپی موجود ہے۔ قیمت تین روپیہ۔

گھروندے جناب عرش تیموری کے پانچ ڈراموں کا مجموعہ ہے، جن میں دو ریڈیائی ڈرامے بھی شامل ہیں اُردو میں افسانہ نگاری تو بہت عام ہے، لیکن ڈرامہ نویسی کی طرف ہمارے ادیبوں نے

زیادہ توجہ نہیں کی تھی اب ریڈیو کے محکمہ نے البتہ اس تحریک میں کچھ جان ڈالی ہے اور لوگ کچھ متوجہ ہو چلے ہیں، انھیں میں سے ایک عرش تیموری بھی ہیں۔

ڈرامے بہ حیثیت مجموعی اچھے ہیں اور مطالعہ کے قابل۔ قیمت ۸؎ اور ملنے کا پتہ: مکتبۂ سلطانی بمبئی (۳)

ہمارے حسین اس کتاب میں جناب طالب دہلوی نے بعض غیر مسلم مشاہیر کے اُن نظموں کو یکجا کر دیا ہے جن میں کردار حسین کو پیش کیا گیا ہے۔

اس نوع کی کتابیں، قطع نظر اخلاقی تعلیم کے ہندو مسلم اتحاد کے لئے بھی بہت مفید ہے اور اس لئے ہم اس کتاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ قیمت ۱؎۔ ملنے کا پتہ: سید ہادی حسین رضوی ۹۹۔ تھامسن روڈ۔ نئی دہلی۔

والگا سے گنگا تک راہل سانکرتیاہن کی ایک مشہور کتاب کا ترجمہ ہے جسے طفیل احمد خاں ام اے اور حامد واحدی نے اُردو میں پیش کیا ہے۔ یہ کتاب موضوع کے لحاظ سے تو نہیں لیکن ٹکنک اور اسلوب کے لحاظ سے یقیناً اُردو میں بالکل نئی چیز ہے۔

ارمان جناب آغا شاعر قزلباش مرحوم کا ناول ہے جسے نگارستان ایجنسی اُردو بازار دہلی نے شایع کیا ہے مرحوم اپنی شاعری اور زباندانی کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے تھے اور ضرورت تھی کہ ان کے تمام ادبی کارناموں کو زندہ رکھا جائے، کیونکہ یہ باتیں اب کہاں سننے میں آئیں گی اور پچھلی معاشرت و معیشت کا حال کون کہے گا۔ قیمت دو روپیہ۔

مولانا ابوالکلام آزاد مولانا ابو سعید بزمی نے اس کتاب میں مولانا آزاد کا قلمی اسکیچ پیش کیا ہے اور پورے جوشِ عقیدت کے ساتھ۔ مولانا بزمی مشہور صحافی ہیں اور بڑے اچھے انشا پرداز، اس لئے وہ مولانا آزاد کے متعلق لکھنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں، انھوں نے مولانا آزاد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس میں زیادہ تر ان کے وہ ذہنی ارتسامات شامل ہیں جو مولانا کی سیاسی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ممکن ہے ان سے بعض کو اختلاف ہو۔ لیکن جس حد تک مولانا آزاد کی ادبی و علمی شخصیت کا تعلق ہے، بزمی صاحب نے پورا حق اعتراف ادا کیا ہے اور اس قدر خوبی کے ساتھ کہ شاید ہی کوئی دوسرا اس فرض سے اس طرح عہدہ برآ ہو سکتا۔

وہ حضرات جو مولانا آزاد کی علمی و سیاسی خصوصیات کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب باوجود مختصر ہونے کے بہت مفید ہے۔ قیمت ۱؎۔ ملنے کا پتہ:۔ اقبال اکاڈیمی۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔

ننگا یا لو جناب شیر محمد اختر کے سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جناب اختر ملک کے مشہور فسانہ نگار ہیں اور انداز بیان کی سادگی کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ شعر کی طرح فسانہ کی خصوصیت بھی

یہی ہے کہ وہ فوراً بغیر فکر و تامل کے اپنا اثر چھوڑ جائے اور جناب اختر کے تمام افسانوں میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ فنی حیثیت سے بھی یہ افسانے مکمل ہیں۔ قیمت ۱؎ عہ۔ ملنے کا پتہ :۔ گیلانی الیکٹرک پریس لاہور۔

موسیٰ سید شہاب الدین نے اس دو جزو کے رسالہ میں حضرت موسیٰ کا اسکیچ اک مخصوص انداز میں پیش کیا ہے جس سے مقصود حق و باطل کی جنگ اور حقیقت و صداقت کی کامیابی کو ظاہر کرنا ہے۔ چونکہ حضرت موسیٰ پیغمبر انقلاب تھے اس لئے موجودہ دور انقلاب میں یہ رسالہ بہت برمحل چیز ہے۔

ملنے کا پتہ :۔ سید شہاب الدین۔ شمسیہ۔ چنچل گوڑا۔ حیدر آباد دکن۔

بادشاہ اُردو ترجمہ ہے مکیاویلی کی تصنیف Prince کا۔ ترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں نے کیا ہے اور مکتبہ جامعہ دہلی نے اسے شایع کیا ہے۔ مکیاویلی کی یہ کتاب بڑی مشہور چیز ہے جس کا ترجمہ عرصہ ہوا عربی میں "کتاب الامیر" کے نام سے ہو چکا ہے۔ شاہ و شہنشاہیت کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ ترجمہ کافی صاف و شگفتہ ہے۔ قیمت ۸؎ عہ

بکھرے موتی میاں عطاء الرحمٰن بی۔ اے کے بائیس افسانوں کا مجموعہ ہے، جسے نہایت اہتمام سے خود مصنف نے شایع کیا ہے۔

میاں صاحب بڑے مشاق فسانہ نگار ہیں اور ان کا یہ مشغلہ پچھلے ۲۵ سال سے جاری ہے، لیکن چونکہ پیشہ ور انشا پرداز نہیں ہیں، اس لئے انھیں لوگوں نے کم جانا۔

میاں صاحب قدرتاً آرٹسٹ پیدا ہوئے ہیں اور ان کی یہ خصوصیت ان کے ہر افسانے سے ظاہر ہے۔ ان کے افسانے حد درجہ دلچسپ ہوتے ہیں اور ایک شخص ان کے پڑھنے کے بعد خاص کیفیت لطف و انبساط کی محسوس کرتا ہے۔ قیمت ہے۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ پاکستان۔ بیرون موچی دروازہ لاہور۔

ملک محمد جائسی پدماوت اور ملک محمد جائسی، دونوں اس قدر مشہور ہیں کہ ان کے تعارف کی ضرورت نہیں، لیکن یہ کتاب یقیناً خاص تعارف چاہتی ہے کیونکہ اس وقت تک پدماوت اور ملک محمد جائسی کے متعلق تحقیق معلومات ہمیں حاصل نہ تھیں۔

جناب سید کلب مصطفےٰ بی۔ اے نے جو خود بھی جائس کے رہنے والے ہیں، اس کتاب کو لکھ کر بڑی اہم خدمت انجام دی ہے۔ اُردو زبان میں یہی پہلی کتاب ہے جو پدماوت اور اس کے مشہور مصنف کو صحیح تاریخی آئینہ میں پیش کرتی ہے اور فاضل مصنف نے اس کی جمع و ترتیب میں جس محنت و کاوش سے کام لیا ہے وہ یقیناً قابل مبارکباد ہے۔ اس کتاب کو انجمن ترقی ہند اُردو دہلی نے شایع کیا ہے اور قیمت بہ ہے

سخن زار تذکرہ ہے صوبۂ متوسط کے موجودہ شعراء کا جسے شاکر اورنگ آبادی نے مرتب کیا ہے۔

ان شعراء کی تعداد اکیس ہے جن میں ناطق گلاؤٹھوی اور راز رامپوری بھی شامل ہیں - اس مجموعہ میں صرف شعراء کی نظمیں انتخاب کی گئی ہیں، اچھا ہوتا اگر غزلیں بھی اس میں شامل کر دیجاتیں -

سی - پی کا صوبہ اُردو سے اتنا بیگانہ نہیں ہے، جتنا سمجھا جاتا ہے، اس لئے شاکر صاحب کی یہ خدمت قابل تحسین ہے کہ انھوں نے اپنے صوبہ کے شاعروں کو ملک سے روشناس کیا - قیمت دو روپیہ -

ملنے کا پتہ :- نشرگاہ ادیب - ناگپور -

جام بیخودی عباس علی خاں بیخود پروفیسر اسلامیہ کالج کلکتہ کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے - شروع میں مولانا وحشت کا مختصر سا تعارف بھی شامل ہے جس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ جناب بیخود فنی نکات سے بھی واقف ہیں اور جذبات کی صحیح ترجمانی بھی کرتے ہیں - اگر بیخود کے کلام میں واقعی یہ دونوں باتیں پائی جاتی ہیں (اور چونکہ جناب وحشت کا فیصلہ یہی ہے، اس لئے یقیناً پائی جاتی ہوں گی) تو اس مجموعہ کی خوبی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے -

جناب بیخود اس دور کے شاعر ہیں جس کی بہار مٹ چکی ہے، تاہم فضا میں "بوئے یاسمن باقی ست" اور اسی خوشبو کا پتہ دینے والوں میں سے ایک بیخود صاحب بھی ہیں - قیمت عہ

نیا راگ زکیہ سلطانہ ساغر نے اس مجموعہ میں بعض مشاہیر شعراء ہند کے کلام کا انتخاب پیش کیا ہے جو رسالۂ ایشیا میں اس سے قبل شایع ہو چکا ہے، انتخاب اچھا ہے اور طباعت و کتابت اس سے بہتر - قیمت عہ - ملنے کا پتہ :- تھیکر اینڈ کمپنی - بمبئی -

دام خیال جناب ضیاء الاسلام پی - سی - اس کے کلام کا مجموعہ ہے جس میں غزلیں کم اور نظمیں زیادہ ہیں - ضیاء الاسلام صاحب اپنے انتقادی ذوق کے لحاظ سے ملک میں کافی شہرت رکھتے ہیں، لیکن اب معلوم ہوا کہ ان کا ذوقِ شعری بھی پاکیزہ ہے -

اس مجموعہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شاعری محض ان کے تاثرات کا نتیجہ ہے اور اسی لئے اُس میں وہ تمام کیفیات موجود ہیں، جو دل کی آواز میں پائی جاتی ہیں - بعض نظمیں جدید رنگ کی بھی ہیں لیکن ان کا پس منظر جذبات کے لحاظ سے یکسر باغیانہ ہے - کتابت و طباعت میں بڑا اہتمام کیا گیا ہے -

قیمت عہ - ملنے کا پتہ : سکریٹری حلقۂ ادب - ۱۳ - اسٹانلی روڈ - الہ آباد -

ہندوستان میں اجنبی راج تصنیف ہے پینڈرل مون کی جو پنجاب میں ڈپٹی کمشنر تھے، لیکن صرف اس لئے مستعفی ہو گئے کہ حکومت کی سیاسیات کو وہ ملک کی آزادی کے منافی سمجھتے تھے - اس کتاب میں انھوں نے اپنے تمام محسوسات و تاثرات کو قلمبند کیا ہے

جو ہندوستان کی دفتری و سامراجی حکومت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس قدر دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے کہ ہم اس سے ایک افسانہ کا سا لطف حاصل کرتے ہیں اس کتاب کا ترجمہ جناب مخمور جالندھری نے کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ جدید لاہور

بزم سخنوراں سید مجتبیٰ حسن بی۔ اے نے اس مجموعہ میں وہ کلام پیش کیا ہے جو دوران مطالعہ میں ان کو پسند آیا۔ اور اس لئے اس کی حیثیت ایک بیاض کی سی ہے۔

شعراء کے انتخاب میں جدید و قدیم کی کوئی تفریق انھوں نے نہیں کی اور نہ کسی خاص صنف کا مطالعہ اپنا نصب العین بنایا۔ اسی لئے اس میں غزلیں، نظمیں اور مثنوی وغیرہ سبھی کچھ پایا جاتا ہے اور حمد و نعت سے لیکر ظرافت تک سبھی کا انتخاب کیا گیا ہے۔

قیمت ۸؎ - ملنے کا پتہ :- نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔

انشا کی تعلیم جناب وقار عظیم ام۔ اے کی تصنیف ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ بچوں میں "انشا پردازی" کی صلاحیت کس طرح پیدا کرنی چاہئے۔ یہ کتاب فن تعلیم سے تعلق رکھتی ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے اُردو میں غالباً بالکل پہلی چیز ہے۔ ضرورت ہے کہ اس قسم کی باتیں بچوں کے نصاب میں شامل کیجائیں مکتبۂ جامعہ دہلی سے خط و کتابت کی جائے۔

منتخب نظمیں ادارۂ جدید ادب فیض آباد نے بعض مشاہیر شعراء کی نظموں کا انتخاب اس نام سے شایع کیا ہے۔ انتخاب کا معاملہ "نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی" کا ہے، اس لئے اس کے حسن و قبح کا فیصلہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

نقش و نقاش جناب سلطان حیدر جوش کا مختصر سا ناول ہے جس کا نام وہ "فاحشہ" رکھنا چاہتے تھے لیکن احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے بدل کر "نقش و نقاش" رکھا۔ اس ناول میں انھوں نے سماج کی اس زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے۔ جس کی لذتوں کی بنیاد زیادہ تر "کھل کھیلنے" پر قایم ہوتی ہے۔

جناب جوش ایک مخصوص رنگ کے انشا پرداز ہیں جس میں مزاح و طنز دونوں نہایت بانکپن کے ساتھ طے ہوتے ہیں اور جو اسلوب بیان کے لحاظ سے کافی ندرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ قیمت ۲؎ - ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایوں

تبصرۂ حیات شبلی مولوی محمد امین زبیری کی تصنیف ہے، جس میں انھوں نے "حیات شبلی" مرتبہ سید سلیمان ندوی پر تبصرہ کرتے ہوئے، مولانا شبلی کی اُس رنگین ادبی زندگی کو پیش کیا ہے جسے سید سلیمان ندوی نے قصداً چھپانا چاہا تھا۔ قصداً اس لئے کہ "حیات شبلی" بھی مولانا شبلی کے خطوط کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھی اور یہ تبصرہ بھی انھیں خطوط کی بنیاد پر قایم ہے۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ سید سلیمان کی نگاہ سے

وہ خطوط نہ گزرے ہوں جن کا ذکر اس تبصرہ میں کیا گیا ہے۔

رسالہ بہت دلچسپ ہے اور رابعہ بک ایجنسی بھوپال سے ۶ر میں مل سکتا ہے

ہندوستانی زبان

جناب امام اکبرآبادی کا مقالہ ہے جس میں انھوں نے ہندوستانی زبان پر سیاسی، قومی اور لسانی حیثیت سے بڑی اچھی بحث کی ہے۔

ہندوستان میں زبان کا جھگڑا بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اسے طے کیا جائے۔ کیونکہ یہی وہ اختلاف تھا جس نے کانگرس کے بعض ذمہ دار حضرات کی عصبیت یا ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کیا۔

جناب امام اکبرآبادی نے نہایت سنجیدگی اور کامل تحقیق کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو کر کے ملک کی آیندہ زبان اور اُردو کی خصوصیات کو پیش کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ یہ مقالہ اہل فکر کی نگاہ سے گزرے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ مصنف سے آبکاری دروازہ آگرہ پر خط و کتابت کی جائے۔

ضرورت رشتہ

کے متعلق جو اعلان پچھلے مہینے نگار میں شایع ہوا تھا، اس کو دیکھ کر بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں سے اکثر قابل جواب نہ تھے، اس لئے بعض اُمور کی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے، تاکہ بیکار مراسلت کی نوبت نہ آئے

۱۔ صرف وہی حضرات خط و کتابت کریں جو حنفی المذہب اور حیدرآباد، دہلی یا یوپی کے باشندے ہوں۔

۲۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ہی معقول مستقل ملازمت یا معقول ذریعہ آمدنی رکھتے ہوں۔

۳۔ ناکتخدا ہوں اور عمر ۳۰ سال سے زیادہ نہ ہو۔

۴۔ مشرقی تہذیب و اخلاق کو پسند کرتے ہوں اور صحیح و توانا ہوں

۵۔ معزز شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہوں اور شادی کو محض جنسی تعلق کی چیز نہ سمجھتے ہوں بلکہ اسے سماج کا سنجیدہ فرض یقین کرتے ہوں۔

۶۔ اپنے مفصل حالات کے ساتھ اپنی تصویر بھی روانہ کریں — جس لڑکی کے لئے رشتہ مطلوب ہے وہ امسال فائنل بی، اے میں شریک ہو رہی ہے، پسندیدہ شکل و صورت رکھتی ہے، نہایت سلیقہ مند اور ہوشیار ہے۔ عمر ۲۰ سال ہے اور لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ لڑکی کی تربیت بالکل مشرقی تہذیب کی ہوئی ہے اور "سوسائٹی گرل" بننا پسند نہیں کرتی۔ رنگ صاف، بدن چھریرا، قد دراز اور نقشہ کتابی ہے۔ تصویر بھی بھیجی جا سکتی ہے اور ابتدائی امور طے ہونے کے بعد ایکدوسرے کو دیکھ بھی سکتے ہیں۔ خط و کتابت کا پتہ یہ ہے: م۔ن۔ ذریعہ دفتر نگار۔ لکھنؤ

موجودہ ادب سے انتخاب

نظم

بانگ درا ... مجلد ... اقبال ... للعہ ۸ر
بال جبریل ... " ... " ... للعہ
ضرب کلیم ... " ... " ... " ... ے
زبور عجم ... " ... " ... للعہ
ارمغان حجاز " ... " ... للعہ ۸ر
بس چہ باید معہ مسافر " ... عہ ۸ر
پیام شباب ... قاضی نذرالاسلام عہ ۴ر
رنگ بست ... اثر لکھنوی ... عہ ۸ر
شعلہ و شبنم ... جوش ملیح آبادی .. صہ ر
عرش و فرش ... " ... " ... للعہ
حسین اور انقلاب " ... عہ
شعرستان ... اختر شیرانی .. عہ
دھڑکنیں ... احمد ندیم ... عہ ۸ر
الطاف کے گیت .. الطاف مشہدی عہ ۸ر
گلبانگ حیات ۔ امین حزیں .. ے ر
کفر و ایمان ... بہزاد لکھنوی .. عہ ۸ر
تعاقہ حاجی تعلق عہ ۱۲ر ؛ منقار تعلق ۔ عہ ۸ر
گیت مالا ۔ صلاح الدین میراجی .. ۸ر
نقش چغتائی ... چغتائی .. عہ
مرقع چغتائی ... " .. عہ ۱۴ر

نثر

رحمت اللعالمین، مکمل تین جلد ... قاضی سلیمان ۔ معہ ۱۴ر
مقالات جمال الدین افغانی مترجم سلیم ڈی۔ ایم۔ لے ۔ عہ ۸ر
راہگذر ... عاشق بٹالوی (افسانے) ..... عہ ۸ر
پطرس کے مضامین ... پطرس (مزاحیہ) عہ ۸ر
مضامین فلک پیما ... (مزاحیہ) ے ۱۲ر
کیلے کا چھلکا ... سندباد جہازی (مزاحیہ) ... عہ ۸ر
گنجہائے گرانمایہ .. رشید احمد صدیقی ..... عہ ۸ر
گفت و شنید ۔ بشیر ہاشمی عہ ؛ گرد و پیش (افسانے) ے ر
خوفناک دنیا ... سید محمد علی شاہ (اول، دوم) ... ے ۱۲ر
اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ... ڈاکٹر عبداللہ ... ۱۲ر
خار و گل ۔ ایم اسلم للعہ ؛ مزاحیہ ڈرامہ ۔ خلیل ... عہ ۸ر
ٹیپو سلطان ۔ امجد علی عہ ؛ جرم و سزا ۔ باری علیگ ۔ عہ ۱۴ر
جاہ و جلال ۔ تبسم عہ ؛ دروازہ ۔ کرشن چندر ... عہ ۸ر
شب غم ۔ ایم اسلم عہ ۱۴ر ؛ کروٹ ۔ منٹو عہ ؛ منٹو کے مضامین عہ ۸ر
لیلے کے خطوط ... قاضی عبدالغفار ..... عہ ۸ر
اس نے کہا ... " ..... عہ ۸ر
مجنوں کی ڈائری " ..... عہ ۸ر
افسانہ زریں ۔ اسما طیب حسین عہ ۸ر ؛ جواب ۔ کرنل مجید ملک عہ ر
شمع ... اے آر خاتون (ناول) ... صہ ر
تصویر ... " ... " ... للعہ ر

تاریخ اسلام
سید امیر علی شاہ
کا
مکمل تین جلدوں
میں بامحاورہ
اور سلیس ترجمہ
از
باری علیگ
فی حصہ عہ ۴ر
مکمل مجلد ہر سہ حصہ
ے ۸ر

نوٹ :۔ مکمل فہرست کتب مفت طلب فرمائیں

اردو اکاڈیمی لاہور

"زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہئے"

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں
چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دُنیا آج کل اسے

نکٹائی مارکہ

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ - مشکی قوام - الائچی دانہ - تیل - عطر - عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبّی احتیاط کے ساتھ طیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے ——— فہرست طلب فرمایئے۔

نکٹائی برانڈ زردہ فیکٹری - ۱۴۱ ہوڑہ روڈ ہوڑہ

ٹیلی گرام "مشکی قوام" ہوڑہ

ٹیلی فون :- ہوڑہ ۴۵۵

شاخیں :-

(۱) ۵۷/۱ - کیننگ اسٹریٹ کلکتہ
(۲) ۲۱۰ - ہیریسن روڈ - کلکتہ
(۳) ۹/۱ - راجہ کٹرہ اسٹرانڈ روڈ - کلکتہ
(۴) ۶۱ - ارسکین روڈ بمبئی
(۵) ۴۱۸ - ڈنکن روڈ - بمبئی
(۶) ۱ - دارووالا برج اسٹیشن روڈ - پونا
(۷) ۱۸۳۸ - کالوپور چکلا - احمد آباد
(۸) ۹۳ - مغل ٹولی - مٹفورڈ روڈ - ڈھاکہ

نیاز فتحپوری کی دیگر تصانیف

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے تین علمی مضامین شامل ہیں:

۱ — چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲ — مادیین کا مذہب

۳ — حرکت کے کرشمے

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشینہ گوئی کر سکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ قاتل ہے، زبان پلاٹ انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، بیمار، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جنکا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء

(مصحفی نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی۔ اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء

(نظیر نمبر)

اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء

یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اسوقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء

اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ
علاوہ محصول

ترجمان ماہ جرأت اشتہار

ایک سال چھ ماہ تین ماہ ایک ماہ

ایک صفحہ ۲۰ روپیہ ۱۲ روپیہ ۷ روپیہ ۳ روپیہ

آدھ صفحہ ۱۲ روپیہ ۷ روپیہ ۴ روپیہ ۲ روپیہ

چوتھائی صفحہ ۷ روپیہ ۴ روپیہ ۲ روپیہ ۱ روپیہ

جنوری سنہ ۴۴ء

(جدید شاعری نمبر)

اس میں بتایا گیا ہے کہ جدید رجحانات شعری کی کیا حقیقت ہے اور آزاد نظم نگاری کا وزن و قافیہ سے بے نیاز ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء

(قرآن نمبر)

اس میں ڈاکٹر اسٹڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ

شش ماہی جاری نہیں ہو سکتا

سالانہ بیرون ہند دس روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ منیجر

کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات اور قواعد طلب کیجئے۔ منیجر

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے